NASTARAN AHSAN FATIHI KI FICTION NIGARI KA MUTALA

A dissertation submitted to the University of Hyderabad in partial fulfilment of the requirement for the award of degree of

MASTER OF PHILOSOPHY

Submitted By

MD NEYAZ ALAM

Under the supervision of

Dr. MD ZAHIDUL HAQUE

DEPARTMENT OF URDU, SCHOOL OF HUMANITIES

UNIVERSITY OF HYDERABAD

HYDERABAD – 500046

JUNE 2019

نسترن احسن فتیحی کی فکشن نگاری کا مطالعہ

(تحقیقی مقالہ برائے ایم۔فل، اردو)

مقالہ نگار:

محمد نیاز عالم

ریسرچ اسکالر: یونی ورسٹی آف

حیدرآباد

نگراں:

ڈاکٹر محمد زاہدالحق

ایسوسیٹ پروفیسر، شعبۂ اردو

یونیورسٹی آف حیدرآباد

شعبۂ اردو، اسکول آف ہیومانٹیز

یونی ورسٹی آف حیدرآباد، حیدرآباد، تلنگانہ 500046

جون 2019

DECLARATION

I, MD NEYAZ ALAM hereby declare that this dissertation entitled "NASTARAN AHSAN FATIHI KI FICTION NIGARI KA MUTALA" submitted by me under the guidance and supervision of Dr. MD ZAHIDUL HAQUE is a bonafide research work which is also free from plagiarism. I also declare that it has not been submitted previously in part or full to this University or any other University or Institution for the award of any degree or diploma.

I hereby agree that my dissertation can be deposited in Shodhganga/INFLIBNET.

Date: 28 JUNE 2019

Signature of the student

Name: MD NEYAZ ALAM

Reg.No. 17HUHL20

CERTIFICATE

This is to certify that the dissertation entitled "NASTARAN AHSAN FATIHI KI FICTION NIGARI KA MUTALA" submitted by MD NEYAZ ALAM Reg.No 17HUHL20 in partial fulfilment of the requirement for the award of degree of Master of Philosophy in Urdu is a bonafide work carried out by him under my supervision and guidance.

This dissertation has not been submitted previously in part or in full to this or any other University or Institution for the award of any Degree or Diploma.

He has presented an article in the following conference "Urdu Afsanon mein Mazhabi Ravadari" presented in one day seminar on 21 Aril 2019. (copy of certificate enclosed)

Signature of Supervisor

Head

Department of Urdu

Dean

School of Humanities

فہرست

پیش لفظ: (1)

باب اول: نسترن احسن فتیحی کے احوال وکوائف (4)

باب دوم: نسترن احسن فتیحی کی ادبی خدمات (21)

باب سوم: نسترن احسن فتیحی کے ناول اور افسانوں کا تنقیدی مطالعہ (41)

حاصل مطالعہ: (117)

کتابیات: (121)

پیش لفظ

پیش لفظ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ہم پر اللہ کا بہت بڑا احسان و کرم ہے۔ میں اس کا شکر گزار ہوں کہ اس کے رحم و کرم سے میرے ایم فل کا مقالہ پائے تکمیل کو پہنچا۔ایم فل میں داخلہ لینے کے بعد جب موضوع کے انتخاب کا وقت آیا تو میرے ذہن میں کئی موضوعات نے دستک دی۔بحیثیت طالب علم میری اتنی صلاحیت نہیں تھی کہ میں اکیلا کسی نتیجے تک پہنچ پاتا۔میں نے ایم فل کے موضوع کے متعلق اپنے استاد محترم ڈاکٹر محمد زاہد الحق صاحب سے مشورہ لیا اور انھوں نے مجھے ''نسترن احسن فتیحی کی فکشن نگاری کا مطالعہ'' کے موضوع پر کام کرنے کا مشورہ دیا۔

اپنے نگراں ڈاکٹر محمد زاہد الحق صاحب کے مشورے سے میں نے اس مقالے کو تین ابواب میں منقسم کیا ہے۔

باب اول میں نسترن احسن فتیحی کے سوانحی احوال اور کوائف کو پیش کیا گیا ہے اس میں ان کے خاندانی حالات ، پیدائش، بھائی بہن، غذا، لباس، تعلیم و تربیت،شادی، اولاد، پیشہ، ادبی سفر، تصانیف اور انعامات و اعزازات سے متعلق معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

باب دوم میں نسترن احسن فتیحی کی ادبی خدمات کو پیش کیا گیا ہے۔اس باب میں انہوں نے اب تک جتنی بھی ادبی خدمات سرانجام دی ہیں اس سے متعلق معلومات پیش کی گئی ہیں۔

باب سوم میں نسترن احسن فتیحی کے ناول اور افسانوں کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔یوں تو مقالے کا ہر باب اہم ہے لیکن یہ باب باقی دونوں ابواب پہ فوقیت رکھتا ہے۔اس باب میں مصنفہ کے ناول ''لفٹ'' اور افسانوی مجموعہ ''کشمکش'' کو بنیاد بنا کر جائزہ لیا گیا ہے۔

اس مقالے کے آخر میں حاصل مطالعہ اور کتابیات درج کی گئی ہیں۔

اظہار تشکر میں، میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کا بے حد شکر ادا کرتا ہوں جس نے مجھے اس قابل بنایا اور اپنے سائے کرم سے نوازا۔میں اپنے استاد محترم ڈاکٹر محمد زاہد الحق کا دل کی عمیق گہرائیوں سے شکر گزار ہوں کہ مقالے کے آغاز سے لے کر اختتام تک ان کی رہبری اور ہمدردی رہی ۔ میں صدر شعبۂ اردو پروفیسر حبیب نثار صاحب کا بھی بہت شکر گزار ہوں کہ دوران تحقیق انہوں نے اپنے نیک مشوروں سے نوازا۔میں شعبۂ اردو کے سبھی اساتذہ کرام کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے قدم قدم پر میری حوصلہ افزائی کی۔

میں اپنے سبھی دوستوں کا شکرگزار ہوں کہ جنھوں نے دوران تحقیق میری حوصلہ افزائی اور مدد کی۔ میں اپنے مرحوم والدین کے لیے دعا گو ہوں کہ اللہ انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام دے۔ میری کامیابی اور کامرانی میں ان کی نیک دعائیں شامل ہیں۔ میں اپنے گھر کے تمام افراد کا شکرگزار ہوں بلخصوص اپنی زوجہ محترمہ شیبہ صدیقی کا شکریہ ادا کرنا کیسے بھول سکتا ہوں جس نے قدم بہ قدم میری حوصلہ افزائی کی۔

ایک بار پھر پیش کیے گئے لوگوں کا دل کی عمیق گہرائیوں سے شکرگزار ہوں۔

شکریہ

محمد نیاز عالم

(ایم فل ریسرچ اسکالر)

شعبہ اردو، یونیورسٹی آف حیدآباد

تاریخ 28 جون 2019

باب اول

نسترن احسن فتیحی کے احوال وکوائف

خاندانی حالات:

نسترن احسن فتیحی کے دادا شاہ ضمیر الدین صوبہ بہار، ضلع سمستی پور کے دلسنگھ سرائے کے ایک گاؤں چک بہاء الدین کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد کا نام مرحوم سید محمد احسن تھا یہ دو بھائی تھے اور ان کی ایک بہن بھی تھی۔ ان کے والد سید محمد احسن طفل عمری میں گاؤں کے ایک اسکول میں زیر تعلیم ہی تھے کہ ان کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ نسترن فتیحی کے دادا نے دوسری شادی کر لی۔ مصنفہ کے والد کو گھر میں چھوٹے بھائی بہنوں کی پرورش، ماں کے سائے سے محرومی اور اپنے والد کی بے توجہی نے رنجیدہ کر دیا۔ ان کے والد کو تعلیم کا شوق تھا اس لیے وہ کلکتہ (کولکاتا) اپنے ماموں کے پاس چلے گئے۔ کچھ سال بعد ماموں کا انتقال ہو گیا۔ ان کے والد نے اپنے تعلیمی سفر جاری رکھنے کے لیے نئے راستے تلاش کیے اور ٹیوشن پڑھانے لگے۔ اس سے ملنے والی رقم سے ایل ایل بی کی ڈگری لے کر وہ سمستی پور واپس آئے اور یہاں وکالت شروع کی۔ اپنے تعلیمی دور کی کہانیاں وہ اپنے بچوں کو سنایا کرتے تھے۔ بچپن کی ان کہانیوں نے نسترن فتیحی کو تعلیم کی اہمیت سمجھا دی تھی اس سلسلے میں وہ کہتی ہیں:

> ''میرے والد اکثر ہم بھائی بہنوں کو اپنے تعلیمی دور کی کہانی سنایا کرتے تھے تا کہ ہمارے دلوں میں بھی علم حاصل کرنے کا شوق اور جذبہ پیدا ہو جائے۔ وہ ہمیں بتاتے تھے کہ ان کے علم حاصل کرنے کا جنون کس طرح ان کے مشکل حالات میں ان کو ہمت دیا کرتی تھی۔ وہ ہمیشہ کہتے تھے "محنت کبھی رائیگاں نہیں جاتی، انسان جب محنت کرتا ہے تو اس کا پھل اسے ضرور ملتا ہے"۔'' (1)

نسترن فتیحی کی پرورش سمستی پور شہر میں ہوئی۔ بچپن میں کبھی کبھی شادی بیاہ کی تقریب میں گاؤں جانے کی وجہ سے ان کے ذہن میں ایسے خوابیدہ مناظر نقش ہو گئے کہ گاؤں سے ان کو آج بھی بہت لگاؤ محسوس ہوتا ہے۔ اپنی ساری مشکلوں کے باوجود گاؤں کی رہائش، وہاں کے ماحول کا خالص پن، سادگی اور قدرت سے وابستگی سب کچھ بہت پسند ہے۔

نسترن فتیحی کا ننیہال ضلع بہار شریف کے ایک گاؤں شیخ پورہ میں ہے۔ ان کے نانا کا اسم گرامی سید وحید الدین ہے۔ وہ ایک مجاور اور صوفی بزرگ تھے اور اپنی زندگی میں قرب الٰہی کے لیے عبادات و مراقبات کرتے رہے۔

دنیا سے اس قدر دور تھے کہ گھر میں تنگی اور کسمپرسی کی حالت تھی۔مصنفہ اپنے نانیہال بہت ہی کم گئی ہیں اس لیے نانیہال کی کچھ ہی باتیں یاد ہیں۔ان کی نانی کا انتقال ہو چکا تھا،ان کی والدہ کے کئی سارے بھائی بہن لڑکپن میں ہی فوت ہو گئے صرف ان کی والدہ اور ان کے دو ماموں بقید حیات رہے۔ایک سید کلیم الدین جو پاکستان جا بسے اور دوسرے سید وسیم الدین جو کہ گھر پر ہی رہے۔اس ضمن میں مصنفہ یوں رقم طراز ہیں:

''مجھے اپنی امی کی زبانی پتہ چلا کہ جب وہ صرف نو سال کی تھیں تو نانا کا انتقال ہو گیا۔میری نانی میری امی کے لیے بہت فکر مند رہتیں کیوں کہ ان کی صحت ٹھیک نہیں رہتی تھی اسی لیے سولہ سال کی عمر میں ہی امی کی شادی کر دی گئی۔ شادی کے کچھ سالوں بعد میری نانی کا انتقال ہو گیا۔اس لیے میری امی بہت ہی کم اپنے مائکے جاتیں اور میں بھی بہت کم نانیہال گئی ہوں۔''(2)

پیدائش

نسترن احسن فتیحی کی ولادت 17 جنوری 1963 کو صوبہ بہار کے سمستی پور ضلع میں ہوئی۔ان کے والد کا نام محمد احسن اور والدہ کا نام حمیدہ احسن ہے۔مصنفہ آٹھ بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹی ہیں۔مصنفہ کے والد کی دوسری شادی ان کی والدہ کے ساتھ ہوئی اس سلسلے میں مصنفہ یوں رقم طراز ہیں:

''تین چھوٹے چھوٹے بچوں نوشابہ سعید ناز،ضیاء احسن اور حبیب احسن کو چھوڑ کر جب میری بڑی امی کا انتقال ہوا تو اس وقت میرے والد کے ساتھ میری ایک بیوہ پھوپھی رہتی تھیں۔ان کی کوششوں اور ضد سے میرے والد کی دوسری شادی میری امی سے ہوئی۔میری پیدائش 17 جنوری 1963 کو ہوئی مگر میٹرک کا فارم بھرتے وقت اسکول میں کسی کی غلطی سے 7 جنوری 1963 درج ہو گیا۔اس طرح سرٹیفیکٹ کے حساب سے میری تاریخ پیدائش 7 جنوری 1963 ہے۔میں اپنے پانچ بھائی بہن ممتاز احسن، یاسمین احسن، معین احسن، نسرین احسن میں سب سے چھوٹی ہوں۔''(3)

بھائی بہن

نسترن احسن فتیحی کے سب سے بڑے بھائی ضیاء احسن جو اپنے والد کے ساتھ وکالت کرتے تھے اب اپنے بچوں کے ساتھ پٹنہ میں سکونت پذیر ہیں۔ ان کی بہن نوشابہ احسن اور بھائی حبیب احسن کا انتقال ہو چکا ہے۔ ان کے بھائی ممتاز احسن بھی پٹنہ میں ہی سکونت پذیر ہیں۔ بہن یاسمین احسن کا انتقال اس کی شادی کے تقریباً 2 سال بعد ہو گیا۔ بھائی معین احسن بینک میں ملازم تھے اور سبک دوشی کے بعد یہ بھی پٹنہ میں رہتے ہیں۔ ان کی بہن نسرین احسن اپنے بچوں کے ساتھ لندن میں مقیم ہیں۔

غذا:

اللہ نے اس دنیا میں کوئی بھی چیز غیر ضروری نہیں بنائی ہے۔ اس نے انسان کے کھانے کے لیے طرح طرح کی سبزیاں اور پھل پھول اس دنیا میں اگائے ساتھ ہی کئی جانوروں کا گوشت بھی حلال کیا۔ اس نے یہ بتایا کہ کس جانور کا گوشت حلال ہے اور کس کا حرام۔ یہ انسان کی مرضی ہے کہ وہ ہری سبزی کھائے یا حلال گوشت۔ مصنفہ کو اللہ کی پیدا کردہ سبھی غذائیں پسند ہیں مگر وہ ہری سبزی کو گوشت سے زیادہ ترجیح دیتی ہیں۔ مصنفہ اپنے غذا کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

> ''میں کھانے میں سبزیوں کو زیادہ ترجیح دیتی ہوں یہ صحت کے لیے زیادہ مفید ہوتی ہیں۔ میں گوشت کو زیادہ نہیں کھاتی۔ میں اپنی عمر کے لوگوں کے ساتھ روایتی کھانے کو بنانے، کھلانے اور کھانے کو جتنا پسند کرتی ہوں اتنا ہی آجکل کے فاسٹ فڈ اور بچوں کے ساتھ نئے نئے کھانے بنانے اور سیکھنے کو بھی پسند کرتی ہوں اور اس سے لطف اندوز ہوتی ہوں۔'' (4)

لباس:

لباس انسان کے لیے بہت ہی اہم اور بنیادی چیز ہے۔ لباس سے انسان کی پہچان ہوتی ہے۔ مختلف مواقع پر انسان مختلف قسم کا لباس پہنتا ہے۔ کچھ لوگ مشرقی قسم کے لباس کو پسند کرتے ہیں تو کچھ مغربی قسم کے لباس پہننا پسند کرتے ہیں۔ مصنفہ ایک گھریلو خاتون ہیں اس لیے وہ سوٹ اور ساڑی دونوں ہی پہننا پسند کرتی ہیں۔ وہ ایک نفاست پسند عورت ہیں اس لیے ان کے کپڑے صاف ستھرے ہوتے ہیں۔ اپنے لباس کے بارے میں وہ یوں رقم طراز ہیں:

> ’’میں سوٹ اور ساڑی دونوں پہنتی ہوں۔ گھر کے اندر سوٹ پہننا پسند کرتی ہوں کیوں کہ یہ آرام دہ ہوتا ہے۔ جب میں باہر کسی سماجی تقریبات یا شادی وغیرہ میں جاتی ہوں تو ساڑی پہننا پسند کرتی ہوں کیوں کہ مجھے ساڑی بہت پسند ہے۔‘‘(5)

تعلیم وتربیت:

نسترن فتیحی کی ابتدائی تعلیم سمستی پور میں ہوئی۔ سمستی پور کے کنگ اڈورٹ اسکول میں ساتویں جماعت تک پڑھائی کی اس کے بعد گرلس ہائی اسکول سمستی پور میں داخلہ لیا اور میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ میٹرک کے بعد وہیں سے ہی انٹر کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ بارہویں جماعت پاس کرنے کے بعد وہ سمستی پور کے ویمنس کالج جو کہ مِتھلا یونی ورسٹی، دربھنگہ کے ماتحت آتی ہے وہاں سے اردو میں بی اے کا امتحان پاس کیا۔ دوران تعلیم ہی ان کی شادی علی رفاد فتیحی سے ہوگئی۔ شادی کے بعد بھی اپنا تعلیمی سفر جاری رکھا۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے میں ان کے شوہر علی رفاد فتیحی اور ان کے گھر والوں کا مکمل ساتھ رہا۔ مصنفہ نے پنجاب یونی ورسٹی، چندی گڑھ سے 1986 میں ایم اے اردو کیا جس میں گولڈ میڈل ملا اور وہیں سے 1991 میں ڈاکٹر ہارون ایوب کی نگرانی میں "فیض کی شاعری کا اسلوبیاتی مطالعہ" کے عنوان سے پی ایچ-ڈی کی سند حاصل کی اور اس میں بھی مصنفہ کو گولڈ میڈل ملا۔

نسترن فتیحی اپنے والد کو ابا اور والدہ کو امی کہتی تھیں۔ کافی بڑا کنبہ تھا کل آٹھ بھائی بہن تھے۔ ان کے بڑے بھائی حبیب احسن جو شاعری کرتے تھے پاکستان جا بسے۔ سب سے بڑی بہن اور بڑے بھائی کی بھی شادی ہو چکی تھی اس لیے بھتیجے بھتیجیاں ساتھ ہی رہتے تھے۔ بھانجے بھانجیاں آتے جاتے رہتے تھے اس لیے ان کے ساتھ دوستی رہتی اور بھتیجے بھتیجیوں پر رعب ڈالتی تھیں۔ اس پر رونق گھر میں لڑکے لڑکیوں کی تعلیم پر بڑا زور تھا۔ دوران امتحان کوئی بھی ان کی پڑھائی میں مداخلت نہ کرتا اور نا ہی ان سے کسی قسم کا کام سرانجام دینے کو کہا جاتا، یہاں تک کہ کھانا اور پانی بھی ان کے سامنے پیش کر دیا جاتا تاکہ یکسوئی سے پڑھائی پر دھیان رہے۔

نسترن فتیحی کو محسوس ہوتا کہ تعلیم حاصل کرنا بڑے اعزاز کی بات ہے شاید یہی وجہ ہے کہ میرا بھی دوران تعلیم سب سے بڑھ کر خیال رکھا جاتا ہے۔ اس سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مصنفہ کے دل میں تعلیم کی اہمیت اور قدر

بچپن سے ہی نقش ہوگئی۔گھر میں کبھی کسی چیز کی کمی نہیں رہی اور نہ ہی بے حد فراوانی۔ذمے داریاں بہت تھیں اور اپنی امی کو بہت محنت کرتے دیکھ کر والدین کی مشکلوں کا احساس بھی ہوتا۔ان کے والدین اس قدر محنت اور کشمکش میں مگن رہتے کہ سیر وتفریح سے بھی محروم رہتے اس ضمن میں مصنفہ یوں رقم طراز ہیں:

"مجھے جب پڑھنا نہیں آتا تھا تب سے بڑے بھائی سارے بچوں کو فرصت کے وقت کہانیاں سنایا کرتے تھے۔ستر کی دہائی میں گلی گلی میں بچوں نے ہی اپنے اپنے گھروں میں لائبریری بنا رکھی تھی جس کا اصول تھا ایک دوسرے سے کتابیں ادل بدل کر پڑھیں یا کچھ پیسے میں کرائے پر لے جائیں تاکہ اس سے نئی کتابیں خریدی جا سکے۔ بھائی اکثر کرائے پر ایک کتاب لے آیا کرتے اور ہمیں بھی کہانی سناتے۔"(6)

نسترن فتیحی کی سب سے بڑی بہن نوشابہ سعید ناز اسکول کی تعلیم سے محروم تھیں مگر گھر کا ماحول اچھا اور ادبی ہونے کی وجہ سے زبان کافی اچھی تھی۔وہ ناول نگاری کرتی تھیں ان کے ناول "حریم" میں قسط وار شائع ہوتے تھے۔ مصنفہ نے جب ہوش سنبھالا تو سارے ناول کتابی صورت میں آچکے تھے۔مصنفہ نے دسویں جماعت کے بعد ان کے ناول پڑھے۔ان میں سے دو ناولوں کے نام ''شعلۂ شبنم'' اور ''عرشیہ'' ہے جو اس وقت مقبول ہوئے تھے یہ دونوں معاشرتی ناول تھے۔جب نوشابہ سعید گھر آتیں تو مصنفہ انھیں بہت رشک سے دیکھا کرتیں کہ یہ کیسے اتنے ضخیم ناول لکھ لیتی ہیں؟۔یہی رشک شوق بن گیا اور آگے چل کر مصنفہ نے بھی اردو فکشن کی دنیا میں قدم رکھا۔

آج کے دور میں لڑکیوں کو سلائی کڑھائی کی تعلیم دی جاتی ہے۔اس زمانے میں بھی یہ تعلیم دی جاتی تھی۔اس لیے ہر لڑکی کی طرح نسترن فتیحی بھی گھر میں سلائی کڑھائی، بنائی ہر چیز میں دلچسپی لیتیں مگر ذمے داری سے کسی کام کو پورا نہ کرتیں۔ان سے بڑی دونوں بہنیں بہت سنجیدہ اور ماں کی چہیتی تھیں۔گھر کے کاموں میں اپنی ماں کی مدد سے فارغ ہو کر اکثر چادر اور غلاف کو کاڑھنے بیٹھ جاتیں۔ایسے وقت میں ان کی والدہ مصنفہ کو بھی پکڑ کر ان کے پاس بیٹھاتیں مگر جلد ہی ریشم الجھا دینے یا ان کے سفید لٹھے پر گندی انگلیوں کے داغ لگا دینے کی شکایت پر وہاں سے بھگا دی جاتیں۔باورچی خانے میں بھی مصنفہ کا دل نہ لگتا مگر وقت کے ساتھ ساتھ اس کو بھی اپنا لیا۔اس ضمن میں وہ یوں رقم طراز ہیں:

''مجھے ناول پڑھنے کا شوق تھا مگر اجازت نہیں تھی۔میگزین ملتا بھی تھا تو سنسر ہوکر۔''حریم''،منگوانے کی اجازت تھی مگر''شمع''اور''بیسویں صدی'' کی پابندی تھی۔میری بڑی بہن کے ہاتھ میں عفت موہانی ، ہاجرہ مسرور ، رضیہ بٹ کے ناول ہوتے تھے۔ جسے دیکھ کر میں بہت بے چین رہتی تھی مگر میری بہن کہتیں کہ "اس عمر میں تم یہ ناول نہیں پڑھ سکتی کچھ دن بعد پڑھنا"۔شاید ایسا اس لیے تھا کہ وہ تیرہ چودہ سال کی عمر میں عشق وعاشقی کے قصے پڑھوانا معیوب سمجھتی تھیں۔مگر جب تک وہ گھر میں ہوتیں میں کسی نہ کسی بہانے کتابیں لے کر پڑھ لیتی تھی۔(7)

ایک بڑے سے کنبے کی چھوٹی سی فرد ہونے کی وجہ سے مصنفہ کی حالت اس گھر میں بڑی مضحکہ خیز تھی۔اس کی وجہ یہ تھی کے وہ اپنے بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹی تھیں اور بھتیجے بھتیجیوں سے ذراسی بڑی۔اس دونوں گروپ کی طرف سے اکثر وبیشتر مشکوک ومتروک ٹھہرائی جاتیں۔. اس کی ایک وجہ انتشار تھا کہ وہ کبھی یہ فیصلہ نہ کر پاتیں کہ ان کو دراصل کس گروپ میں زیادہ مزہ آتا ہے اور اسی وجہ سے کوئی بھی گروپ اپنا وفادار نہیں سمجھتا تھا پھر بھی ان کا بچپن بہت مزے میں گزرا۔نسترن فتیحی بچپن کا ایک مضحکہ واقعہ سناتی ہیں جسے مندرجہ ذیل اقتباس میں پیش کیا جارہا ہے:

"آنگن میں لوہے کے پائپ سے لگے جھولے پر میرے بھتیجے بھتیجیوں کا گروپ پینگے لے رہا تھا اور میں لیڈر بنی ان کے ساتھ موجود تھی۔مجھ سے بڑے بھائی جو مجھ سے پانچ سال بڑے تھے اور ہر وقت مجھ پر رعب جماتے رہتے اپنے چند دوستوں کے ساتھ آئے۔سارے بچوں کو وہاں سے بھگا کر پائپ سے جھولے کی رسی ہٹا کر اس پر کرتبیں کرنے لگے جسے وہ اکسرسائز کرنا بتا رہے تھے۔میرے کھیل میں مخل ہوئے تھے اس لیے میں کینہ توز نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے وہیں اڑیل ٹٹو کی طرح کھڑی رہی۔۔ایک اکیلی تماش بین کو پا کر بھائی اور ان کے دوستوں میں کچھ زیادہ ہی جوش آ گیا جب ان کی شیخیاں مجھ سے برداشت نہ ہوئی تو میں نے چیلنج کر دیا کہ یہ ایسا کوئی مشکل کام نہیں میں بھی کر سکتی ہوں۔چیلنج قبول کرتے ہوئے لڑکوں نے مجھے پائپ سے صرف لٹک کر دکھانے کے لیے کہا۔میں گئی تو پتہ چلا کہ میں ان بارہ تیرہ سال کے لڑکوں کی طرح اچھل

کر پائپ تک نہیں پہنچ سکتی تھی اس لیے میرے لیے ایک اسٹول لا دیا گیا۔۔ میں اس پر چڑھ کر پائپ سے لٹک گئی اور اسٹول ہٹا دیا گیا۔۔ اب شرط کے مطابق مجھے ہاتھ چھوڑ کر نیچے کود جانا تھا۔ بظاہر آسان نظر آنے والا کرتب مجھے مشکل لگنے لگا۔۔ ہاتھ کی تکلیف سے میرا چہرہ سرخ ہونے لگا اور مجھے احساس ہوا کہ پائپ کی موٹائی کو اپنی گرفت میں لینے کے لیے میری ہتھیلیاں چھوٹی پڑ رہی ہیں اور پکڑ بنانا مشکل ہو رہا ہے پھر بھی میں پائپ چھوڑنے کی ہمت نہ جٹا پائی اور میری ہوٹنگ شروع ہوگئی۔ شور کی آواز پر امی آ گئیں، سب بھاگ گئے اور امی نے مجھے اسی کیفیت میں کئی دھپ لگائے اور نیچے آنے کو کہا۔ انھیں یہ اندازہ بعد میں ہوا کہ میں شوقیہ پائپ سے نہیں چپکی ہوئی ہوں بلکہ مجھ میں نیچے کودنے کی ہمت نہیں ۔ امی نے نیچے تو اتار لیا پر اسکے بعد سے وہ میری طرف سے فکر مند رہنے لگیں اور میری شرارتوں اور کھیل پر روک ٹوک شروع ہوگئی‘‘(8)

نسترن فتیحی اسکول میں بہت فعال تھیں ہر طرح کے کھیل میں حصہ لیتیں۔ کبڈی کھیلنے سے لے کر ہائی جمپ لانگ جمپ ہر ایک کھیل میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتیں ۔ جنوری کی تقریبات میں جتنے طرح کے کھیل ہوتے ان میں ریس ہو یا بوری میں پیر باندھ کر دوڑنا یا پھر چمچ میں نیمبو لے کر دوڑنا، اس طرح کے سبھی کھیل میں بھی حصہ لیا کرتیں ۔ مصنفہ کی امی نے کتابوں کی طرف متوجہ کیا اور مطالعے کا شوق جگایا اور کہانی کی طرف توجہ مبذول کرائی۔ اس طرح کتابوں نے سوچنا اور گھر میں بیٹھنا سیکھا دیا اور وہ اپنے ہر عمل کو تولنے پرکھنے لگیں ۔ پڑھنے لکھنے سے رغبت کے بارے مصنفہ یوں رقم طراز ہیں۔

" دراصل جاگتی آنکھوں کے خواب سوتی آنکھوں کے خواب سے زیادہ دھندلے ہوتے ہیں۔ اوران کا خاکہ بالکل اس طرح رفتہ رفتہ مکمل ہوتا ہے جیسے کوئی مصور کینوس پر پورٹریٹ بناتا ہے۔ پہلے ایک لکیر پھر دوسری اس طرح برش کی ہر جنبش اس خاکے کو مکمل کرتی جاتی ہے۔ اور پھر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ جب وہ خاکہ کینوس پر پوری آب و تاب کے ساتھ مکمل اور واضح ہو جاتا ہے۔ میری خواہشوں کے کورے کینوس پر میرے خواب کا خاکہ بھی ایسے ہی مکمل

ہوا ہے۔ پیچھے جا کر دیکھوں تو دو باتیں ایک ساتھ یاد آتی ہیں۔

پہلی یہ کہ شعور آنے سے بہت پہلے مجھے پنسل اور نوٹ بک کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ میرا دل چاہتا میری پنسل کا ڈبہ رنگ برنگی پنسلوں سے بھر جائے۔ اس میں روز ایک نئی پنسل آ جائے، بالکل سجیلی نوک والی شارپرنر سے بنی ہوئی مگر ڈبے میں ایک ہی پنسل ہوتی تھی اور وہ بھی امی کے ذریعے چاقو سے بنائی ہوئی جو چھوٹی ہوتے ہوتے بس جب اتنی رہ جاتی کہ انگلیوں کے درمیان پکڑ میں نہ آتی تب دوسری پنسل ملتی۔ اس شوق کی کوئی خاص وجہ نہ تھی۔ میرے باقی بھائی بہن عیدی کے پیسوں سے مزے مزے کی چیزیں کھاتے اور میں ایک زخیم سی کاپی خرید کر آ جاتی۔ اتنی زخیم کے چھوٹی کلاسز میں اس طرح کی کاپی رکھنا خواب تھا۔ اس میں اسکیچز بناتی یا کورس کے کام کرتی۔ اور سال بھر کا حساب لگاتی کہ اگلی عیدی ملنے تک مجھے اسے چلانا ہے۔

دوسری بات یہ یاد آتی ہے کہ یہ شوق عمر کے ساتھ ساتھ منزلیں طے کر رہا تھا اور میں اپنے خواب کبھی ماں کی آنکھوں سے دیکھتی تو ایک اچھی میزبان اور کُک بننا چاہتی، والد کی آنکھوں سے دیکھتی تو ایک ڈاکٹر بننے کا خواب پال لیتی۔ بھائی ایک بہترین کرکٹر بنانے پر تلے تھے۔ گویا وہ زمانہ، اس وقت کی بندشیں، محدود وسائل اور سادہ طرز زندگی میں میرا شوق ہی سب سے زیادہ بے ضرر ثابت ہوا، جس پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ ایک ہی پنسل کا ملنا محدود مالی وسائل کی وجہ سے نہیں بلکہ زندگی میں عائد کردہ کچھ بنیادی اصول کی وجہ سے تھے۔ جہاں ہمیں اپنی خواہشوں کی بیجا بڑھتی ہوئی پرواز کو روکنے کے لیے پنکھ کترنے کا ہنر سکھایا جاتا تھا۔ اور یہ ہنر سیکھنا ہر دور میں ضروری ہوتا ہے کیوں کہ یہ پنکھ اگتے بھی اسی تیزی سے ہیں جس تیزی سے آپ ترقی کرتے ہیں۔'' (9)

دھیرے دھیرے مصنفہ کے خواب میں بھی نئے نئے رنگ بھرتے گئے۔ جب پنسل اور نوٹ بک مشکل نہ رہی تو خوبصورت ڈائری رکھنے اور لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ وہ پورا ہوا تو کمپیوٹر، لیپ ٹاپ اور ٹیب تک بات پہنچی۔

یوں مصنفہ کے خوابوں میں رنگ بھرتے چلے گئے اور عملی میدان کا خاکہ مکمل اور واضح ہو گیا۔تعلیم مکمل کرنے کے ساتھ لکھنے کے شوق نے اس کا عادی بنا دیا، گھر کی ذمے داریوں کی وجہ سے مصنفہ کو اس شوق کے علاوہ کسی دوسرے شوق کو پالنے کی مہلت نہ دی۔

شادی:

نسترن احسن فتیحی جب ویمنس کالج سمستی پور جو کہ متھلا یونی ورسٹی، دربھنگہ کے ماتحت آتی ہے وہاں سے گریجوایشن اردو آنرس کر رہی تھیں اور سال آخر کے امتحان کا رزلٹ بھی نہیں آیا تھا کہ مارچ 1983 میں سارن ضلع کے چھپرہ شہر میں پولس محکمہ میں ملازمت کرنے والے علی عباد فتیحی کے لڑکے علی رفاد فتیحی سے شادی ہوگئی۔ان کے شوہر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد سولن ہماچل پردیش میں ملازمت کر رہے تھے۔

نسترن فتیحی کے شوہر دو بھائیوں میں چھوٹے تھے اور ان کی پانچ نندیں تھیں۔سسرال میں ادبی ماحول ہونے کی وجہ سے ان کی ساری نندیں گریجوئٹ ہیں۔ان کے سسرال والوں نے انھیں کبھی بہو نہیں مانا بلکہ جیسے بیٹی کے ساتھ پیار محبت اور حسن واخلاق کے ساتھ رہتے اور خیال رکھتے ہیں بالکل ویسا ہی پیش آتے تھے۔چوں کہ ان کے شوہر شادی کے وقت گھر سے دور سولن میں ملازمت کرتے تھے اس لیے انھیں بھی شادی کے کچھ ہی دنوں بعد ان کے ساتھ جانا پڑا۔سال دو سال کے وقفہ پر اپنے بچوں کے ساتھ سسرال آنے کا موقع ملتا اور کچھ دن رہ کر واپس چلی جاتیں۔اس وجہ سے وہ مسلسل اپنے سسرال میں نہیں رہ پائیں مگر جب کبھی بھی موقع ملتا اپنے ساس اور سسر کی خدمت کرتیں۔

شادی کے کئی سالوں بعد ان کے شوہر سولن کی نوکری چھوڑ کر واپس علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی آ گئے۔ پہلے وہ یہاں کے طالب علم تھے مگر اس وقت بطور مدرس آئے تھے اس لیے مصنفہ بھی اپنے شوہر کے ساتھ علی گڑھ آئیں۔ یہاں ان کے ساس اور سسر کبھی کبھی آتے اور کچھ دن رہ کر واپس چلے جاتے۔ جب وہ آتے تو ان کی خدمت کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتیں۔ان کے شوہر نے پی ایچ ڈی لے کر Cornell University, USA میں تین سال نوکری کی۔اس وقت ان کے سسر کی طبیعت صحیح نہیں تھی اس لیے وہ اپنے شوہر کے ساتھ امریکہ نہیں جا سکیں مگر ان کے ساتھ بعد میں کوریا جانے کا موقع ملا۔

اولاد:

ایم اے اردو کے بعد نسترن فتیحی نے پی ایچ-ڈی میں داخلہ لیا۔اس وقت یہ ایک بچی کی ماں بن چکی تھیں پھر بھی تعلیم جاری رکھا کیوں کہ ان کو حوصلہ دینے والے بہت سارے لوگ تھے۔خاص کر ان کے شوہر علی رفاد فتیحی کا بہت ساتھ رہا پھر بھی کبھی کبھی ہمت ہارتی اور ٹوٹتی ہوئی محسوس کرتیں مگر شوق ٹوٹی ہوئی ہمت کو سنبھال دیا کرتی تھی۔ وقت کے ساتھ ان کی ذمے داریاں بڑھتی گئیں اور اس میں الجھتی گئیں۔تعلیم کے بعد کئی جگہ نوکری کرنے کی کوشش کی مگر گھر اور باہر دونوں سنبھالنا ہمیشہ مشکل ثابت ہوتا ہے اور ان کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ تھا کیوں کہ ان کے شوہر خود بہت مصروف رہتے اور یہ گھر کی ذمے داریوں میں الجھی رہتیں۔

نسترن فتیحی کو دو اولادیں ہیں اور دونوں ہی بیٹیاں ہیں۔انہوں نے اپنی دونوں بیٹیوں کو اچھی تعلیم و تربیت دی۔ بڑی بیٹی سنبل فتیحی ایک ڈینٹسٹ ہے اس کی شادی ایک انجینئر سے کرائی اور وہ اپنے شوہر کے ساتھ جدہ، سعودی عرب میں رہتی ہیں۔اسی بیٹی سے ایک نواسی بھی ہے۔مصنفہ کئی مرتبہ ان سے ملنے سعودی عرب جا چکی ہیں اور اسی درمیان عمرہ بھی کیا۔دوسری بیٹی سمن فتیحی جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی سے M.Sc Bio Informatics کرنے کے بعد دہلی میں IGIB میں نوکری کرتی ہے۔

پیشہ:

نسترن احسن فتیحی پیشے سے یہ ایک گھریلو خاتون ہیں اور شوقیہ اردو زبان میں ناول اور افسانہ لکھتی ہیں۔ ایم اے اور پی ایچ-ڈی دونوں میں گولڈ میڈلسٹ ہونے کے باوجود بھی پہلی ترجیح ہمیشہ سے گھر کو دیا اس لیے کبھی مستقل مزاجی سے کوئی نوکری نہیں کی۔مختصر وقفے کے لیے کالج اور اسکول میں تدریس کا کام کیا مگر گھریلو ذمے داریوں کی وجہ سے ہر جگہ استعفٰی کرنا پڑا۔سب سے پہلے چھپرہ کے ایک کالج میں شوقیہ پڑھایا جس میں ان کے شوہر علی رفاد فتیحی کے بڑے بھائی علی فواد فتیحی اردو کے پروفیسر تھے، یہ کچھ عرصہ پہلے صدر شعبۂ بننے کے بعد وہاں سے سبک دوش ہو گئے۔اس کے بعد جب علی گڑھ آئیں تو یہاں اقراء اسکول میں تقریباً دو سال پڑھایا یہاں سے بھی استعفٰی دینا پڑا۔گھر کی بڑھتی ذمے داریوں کے سبب مصنفہ نے بار بار لکھنے کے شوق سے

بھی دامن بچایا مگر اس شوق نے ان کا دامن نہ چھوڑا وہ کہتی ہیں:

''میں شروعات میں سارے کام سے فرصت پا کر بس رات میں ہی لکھا کرتی تھی۔ اکسر فجر کی اذان ہو جاتی پڑھتے یا لکھتے اور جاگتے ہوئے مگر کبھی بھی میں نے اسے شائع کرانے کی پرواہ نہ کی۔ لکھنے کا یہ سلسلہ بھی صرف دو لوگوں کی وجہ سے شروع ہوا ایک میرے شوہر علی رفاد فتیحی جو تکئے کے نیچے پڑی میری کوئی تحریر اٹھا کر پوسٹ کر دیا کرتے تھے اور دوسرے ایک شاعر کے مدیر افتخار امام صدیقی جو خط لکھ کر مجھ سے افسانہ مانگتے۔ اس طرح یہ عمل برقرار رہا۔'' (10)

ادبی سفر:

شادی کے بعد نسترن احسن فتیحی کو ایسا ماحول ملا جس نے ان کے شوق کو جلا بخش دیا۔ چوں کہ ان کے شوہر نے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے تعلیم حاصل کی تھی اس لیے وہ عورتوں کی تعلیم کی اہمیت کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ ان کے شوہر علی رفاد فتیحی نے مصنفہ کو آگے تعلیم جاری رکھنے کی ترغیب دی اور ان کا داخلہ پنجاب یونی ورسٹی، چنڈی گڑھ میں کرا دیا۔ اس وقت وہ ہماچل پردیش سولن میں اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سنٹر سے جڑے ہوئے تھے۔ وہاں کی لائبریری میں کثیر تعداد میں کتابیں تھیں۔ مصنفہ نے ایم اے کے دوران خوب مطالعہ اس ضمن میں وہ یوں رقم طراز ہیں:

"ایم اے کے دوران مجھے میرے شوہر کی طرف سے قرۃ العین حیدر، عبداللہ حسین، خدیجہ مستور کو پڑھنے کی ترغیب ملی۔ ادب کے لیے میری فہم میں اضافہ ہوا۔ میں جو چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھ کر چھپا کر رکھ دیا کرتی تھی اسے باضابطہ لکھنے اور جاری رکھنے کا حوصلہ ملا۔ میں نے باضابطہ پورے اعتماد کے ساتھ پہلا افسانہ ''تشنگی'' نوے کی دہائی میں ایم اے کرنے کے دوران لکھا جسے میرے شوہر نے "شاعر" میں بھجوا دیا جو شائع ہو گیا۔ میں خوشی سے پھول نہ سمائی۔ اس افسانے پر میرے پاس مبارک باد کے لیے کئی خط آئے جو میرے لیے بہت بڑی بات تھی" (11)

نسترن احسن کو لکھنے کا بہت شوق ہے یہ ان کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ ڈائری لکھنے کا شوق بچپن سے ہی تھا۔

کچھ نہیں تو وہ ڈائری ضرور لکھتیں ۔اسی ڈائری کو دیکھ کر ان کے شوہر نے ان سے کہا تھا ''تم ڈائری بہت اچھی لکھتی ہو جیسے کوئی بیانیہ لکھ رہی ہو۔اسے پڑھ کر مجھے کچھ کچھ ناول پڑھنے کے جیسا لگتا ہے ۔تم ناول کیوں نہیں لکھتی؟ تمہیں ایک ناول لکھنا چاہیے''اور پھر ان کے اصرار کے بعد مصنفہ نے ناول ''لفٹ'' لکھنا شروع کیا اس ضمن میں وہ کہتی ہیں:

" میرے شوہر نے ایک دن میری ڈائری کو دیکھ کر کہا کہ تمہیں لکھنے کا بہت شوق اور تم ڈائری بہت اچھی لکھتی ہو،تم ایک اچھا ناول لکھ سکتی ہو۔میں پہلے ان کی اس بات پر کوئی خاص توجہ نہیں دے سکی کیوں کہ میں اپنے گھر کو زیادہ ترجیح دیتی ہوں۔ مجھے لگا کہ ناول لکھنا اتنا آسان کام نہیں ہے اس کے لیے فرصت اور کافی وقت کی ضرورت ہے۔ پھر ان کے اصرار کی وجہ سے میں نے ناول "لفٹ" بہت ہی بے یقینی سے لکھنا شروع کیا کیونکہ مجھے یقین نہیں تھا کہ میں ناول لکھ سکتی ہوں "اس طرح ناول لفٹ وجود میں آیا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ ناول افسانہ لکھنے سے زیادہ مشکل فن ہے مگر بہت دلچسپ مشغلہ ہے۔ہم ناول کے فارم میں اپنے خیالات کو زیادہ بھرپور طریقے سے پیش کر سکتے ہیں۔ دوسرا ناول ''نوحہ گر'' بھی لکھا مگر کئی سال سے مکمل ہونے کے باوجود شائع نہیں کرا پائی۔اس کی وجہ شاید آن لائین میگزین کی اشاعت کی مصروفیت ہے جسے سال میں ایک بار ہم لوگ کتاب کی شکل میں لانے میں بھی کامیاب ہو رہے ہیں۔"(12)

تصانیف:

نسترن احسن فتیحی شروع سے ہی گھر اور گھر کے افراد کو پہلی ترجیح دیتی آئی ہیں اس لیے وقت کی کمی رہی۔ اگر فرصت کے کچھ لمحات مل بھی جاتے تو اسے بچوں کے ساتھ گزارتیں اور ان کی تعلیم و تربیت میں مدد کرتیں۔اس وجہ سے مصنفہ کے بہت زیا تصانیف تو نہیں ہیں مگر ان کی جتنے بھی تصانیف تھے اسے بھی کبھی شائع کرانے کے لیے نہیں سوچا۔ان کی دو بیٹیاں ہیں ان بچوں کا تعلیمی دور جب ختم ہوا۔گھر کی ذمے داریاں کچھ کم ہوئیں تو ان کے دل میں بھی اپنی تصانیف شائع کرانے کا شوق ہونے لگا۔زیادہ لکھنے کا اور سرکاری اداروں سے پروجکٹ حاصل کرنے کا بھی شوق وقت کے ساتھ بڑھتا گیا۔کچھ سرکاری پروجکٹ بھی حاصل کرنے میں کامیابی ملی۔اس کے علاوہ صرف اپنی اور

اپنی بچیوں کی طاقت اور وساطت کی بنیاد پر خاموشی سے ''اوزا ایجوکیشنل سوسائٹی'' کے نام سے رجسٹرڈ ایک غیر سرکاری تنظیم (این جی او) چلا رہی ہیں۔ ہر چھوٹی بڑی کامیابی ان کے سارے شوق کو بڑھاتی گئی۔ اب ایک برقی جریدہ "دیدبان" کی اشاعت اور ایک سیریل ''آکانکشا'' کے اسکرپٹ رائٹنگ کے معاہدے نے زیادہ مصروف کر دیا ہے مختلف پروجکٹ پر کام کرنے کی وجہ سے افسانہ اور ناول تحریر کرنے کا شوق پس پشت چلا گیا ہے اور پروفیشنل رائٹنگ نے بے حد مصروف کر دیا ہے۔ وہ اس ضمن میں یوں رقم طراز ہیں:

" میں اپنے مخلص رشتوں اور دوستوں کا ساتھ نہیں چھوڑنا چاہتی اور کوشش کرتی ہوں کہ میرے قدم زمین سے اکھڑ نہ جائیں۔ ہر عمر کے لوگ میرے دوست ہیں کچھ بچے ہیں، کچھ نوجوان کچھ ہماری عمر کے ہیں تو کچھ مجھ سے بھی زیادہ عمر کے لوگ ہیں۔ میں بہت جلد کسی کے ساتھ باتیں نہیں کرتی۔ ہاں جب باتیں ہوتی ہیں اور ہمارے خیالات ملتے ہیں تو میں اس دوستی کو برقرار رکھتی ہوں۔ میں خوش قسمت ہوں کہ اس دنیا اور اس دور میں میرا دامن خالص محبتوں سے بھرا ہوا ہے۔ اپنی بیماری کے دوران میں نے ان دعاوں کی طاقت کو محسوس کیا جو آپ لوگوں کی طرف سے مجھے ملی اور میں پھر سے سب کے ساتھ ہوں"۔(13)

ایک نظر ان کی اب تک کی ادبی اور اکیڈمک کاموں پر ڈالتے ہیں۔ یہ ان کی عمر کی طوالت کے حساب سے زیادہ نہیں مگر قابل دید ہیں۔

افسانہ:

ا۔افسانوی مجموعہ ای بک کی شکل میں اعجاز عبید کے ذریعے مرتّب کر کے بزم اردو لائیبریری میں شامل کیا گیا ہے۔ http://www.lib.bazmeurdu.net پر یہ دستیاب ہے۔افسانوی مجموعہ کبھی کتابی شکل میں شائع نہیں ہوا۔

ناول:

1۔لفٹ ناول (پہلا ایڈیشن) مطبوعہ 2003، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ۔

2۔لفٹ ناول (دوسرا ایڈیشن)مطبوعہ 2017،ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس،دہلی۔

3۔ناول نوحہ گر۔زیرطبع۔

تنقید وتحقیق:

1۔ایکوفیمینزم اور عصری تانیثی اردو افسانہ‘‘ ۔ (پہلا ایڈیشن)مطبوعہ 2016 ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس،دہلی۔

2۔ایکوفیمینزم اورعصری تانیثی اردو افسانہ‘‘۔(دوسرا ایڈیشن)مطبوعہ 2018۔عکس پبلیکیشن کراچی پاکستان۔

پروجکٹ:

1۔’’قانونی فرہنگ‘‘ قومی کونسل برائے فروغ اردوزبان کے لئے ایک پروجکٹ 2017 تا 2018۔

آن لائن:

اردوجریدہ ’’ دیدبان‘‘ کی مجلس ادارت میں شامل۔

https://www.deedbanmagazine.com

یہ ایک آن لائین میگزین ہے جس کی ایڈیٹر مصنفہ کے ساتھ دواورخواتین ہیں سلمی جیلانی اور سبین علی یہ تینوں مل کراس برقی جریدے کا ہرکام خودکرتی ہیں۔اس کے اب تک دس شمارے آچکے ہیں اوردوجلدیں شائع ہوچکی ہیں۔

کتابی سلسلہ:

1۔دیدبان اردوادبی جریدہ۔جلد۔1مطبوعہ 2017 ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس،دہلی۔

2۔دیدبان اردوادبی جریدہ۔جلد۔2مطبوعہ 2018 ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس،دہلی۔

اس کے علاوہ افسانے ،مضامین، انشائیہ،سفرنامے اورنثری نظمیں ہندستان اور پاکستان کے مختلف اردو رسائل وجرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

انعامات واعزازات

مصنفہ اسکول اور کالج میں کافی فعال تھیں اس لیے میوزک ، پینٹنگ ،کھیل اورتحریری مقابلے میں ہمیشہ حصہ لیا اور انعامات جیتے ۔ چندی گڑھ کے ایک ہندی اخبار دینک ٹریبیون کا اعلان دیکھ ایک اسٹوری مقابلہ کے لیے ایک افسانہ لکھا تھا۔اس اخبار نے ایک ہفتے کے اندر کمپیٹیشن کے لیے افسانہ مانگا تھا۔افسانہ ''کشمکش'' لکھ کر مصنفہ نے اس مقابلے میں بھیجا۔اس میں دوسرا انعام ملا اور شملہ میں دینک ٹریبیون کی طرف سے اس اخبار کے کسی خاص دن کے موقع پر ایک بہت بڑی تقریب کا اہتمام کیا گیا۔جس میں اس وقت کے چیف منسٹر شانتا کمار بھی شریک تھے۔اسی پروگرام میں انعام جیتنے والی تین ادیبہ کو پہلا دوسرا اور تیسرا انعام پیش کیا گیا جس میں ہزار، دو ہزار کی رقم کا ایک چک اور شانتا کمار کے ہاتھوں ہماچلی ٹوپی پہنائی گئی۔ یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ وہ انعام تین لڑکیوں نے ہی جیتا۔ بعد میں یہ افسانہ ''شاعر'' میں شائع ہوا اور اس کے لیے آنے والے تعریفی خطوط میں سے کچھ اب بھی ان کے پاس محفوظ ہیں۔

1۔ گولڈ میڈل ایم اے اردو (1986)۔

2۔ گولڈ میڈل پی ایچ ڈی اردو (1991)۔

3۔ بہار اردو اکیڈمی سے ''ایکوفیمینزم اور عصری تانیثی اردو افسانہ'' کو دوسرا انعام (2016)۔

4۔ یوپی اردو اکیڈمی سے ''ایکوفیمینزم اور عصری تانیثی اردو افسانہ'' کو پہلا انعام (2016)۔

حواشی

(1) ڈاکٹر نسترن احسن فتیحی، شخصی انٹرویو، 20 فروری 2018 وقت 4:00P.M

(2) ایضاً

(3) ایضاً

(4) ایضاً

(5) ڈاکٹر نسترن احسن فتیحی، شخصی انٹرویو بہ ذریعہ فون 4 اپریل 2018، وقت 10:00A.M

(6) ایضاً

(7) ایضاً

(8) ڈاکٹر نسترن احسن فتیحی، شخصی انٹرویو، 29 اکتوبر 2018 وقت 2:00P.M

(9) ایضاً

(10) ایضاً

(11) ڈاکٹر نسترن احسن فتیحی، شخصی انٹرویو، 20 فروری 2018 وقت 4:00P.M

(12) ڈاکٹر نسترن احسن فتیحی، شخصی انٹرویو بہ ذریعہ فون 4 اپریل 2018، وقت 10:00A.M

(13) ایضاً

باب دوم

نسترن احسن فتیحی کی ادبی خدمات

نسترن احسن فتیحی نے اردو ادب کے لیے اپنی عمر کی طوالت کے حساب سے بہت ہی کم کام کیا ہے لیکن جتنا بھی کام کیا ہے وہ قابل ستائش ہے۔ان کی تصانیف کو پڑھنے کے بعد قاری بہ آسانی ان کی علم و ادب کے ساتھ دلچسپی اور گہری محبت کو سمجھ پاتا ہے۔ان کی تصانیف کی تعداد کم ہونے کی بہت ساری وجوہات سامنے آتی ہیں مثلاً وہ اپنی ازدواجی زندگی سے بہت خوش ہیں اور اس میں مشغول رہنا بہت ہی زیادہ پسند کرتی ہیں۔ان کی دو بیٹیاں ہیں جن کی پرورش اور تربیت میں وہ ہمیشہ پیش پیش رہتی ہیں۔زمانے کا یہ ہمیشہ سے دستور رہا ہے کہ لڑکوں کے مقابل لڑکیوں پر بہت ہی زیادہ نظر رکھی جاتی ہے اور لڑکی کو گھر کی عزت کہتے ہیں۔ان کی ایک غلطی بھی سماج کو برداشت نہیں ہوتی۔اس لیے جس گھر میں لڑکیاں ہوتی ہیں اس گھر کے افراد کی ذمے داریاں بڑھ جاتی ہیں۔وہ اپنی بچیوں کو اچھی تعلیم و تربیت دیتے ہیں تا کہ لڑکیاں بھی اپنی ذمے داریاں سمجھیں اور اپنے گھر کا پورا خیال رکھیں۔مصنفہ اپنے بچوں کی تربیت کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

> ''میری شادی زمانہ طالب علمی میں ہی ہوگئی۔اس زمانے میں لڑکیوں کی شادی جلد کر دیا کرتے تھے اس لیے میری شادی بھی پڑھائی کے دوران ہی ہوئی۔شادی کے کچھ سالوں بعد اللہ نے مجھے ماں کا درجہ عطا کیا۔ میری دو بیٹیاں ہیں میں نے ان کی تعلیم اور تربیت پر بہت ہی زیادہ توجہ دی ہے۔آج انہیں دیکھ کر دل کو خوشی محسوس ہوتی ہے۔میری بیٹیاں ہی میرے بیٹے ہیں۔ جب یہ چھوٹی تھیں تو مجھے دن میں پڑھنے اور لکھنے کا وقت نہیں ملتا تھا۔مجھے بچپن سے ہی لکھنے کا بہت شوق ہے اس لیے اکثر راتوں کو شوقیہ طور پر لکھا کرتی تھی۔ اب میں بھی بڑھاپے کی دہلیز پے قدم رکھ چکی ہوں اور بچے بھی بڑے ہو گئے ہیں اس لیے راتوں کو جاگ کر لکھنا اور پڑھنا مشکل کام ہو گیا ہے۔اب دن میں ہی فرصت نکال کر اس کام کو انجام دیتی ہوں''(1)

افسانہ نگاری:

نسترن احسن فتیحی جب پنجاب یونی ورسٹی، چندی گڑھ سے ایم اے اردو کر رہی تھیں اسی دوران انہوں نے اپنے پورے اعتماد اور یقین کے ساتھ اپنا پہلا افسانہ ''تشنگی'' نوے کی دہائی میں لکھا تھا جو ماہنامہ

''شاعر''ممبئ سے شائع ہوا۔اس طرح مصنفہ نے اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا۔جب یہ افسانہ شائع ہوا تو مبارک باد کے کئی سارے خطوط آئے لوگوں کی مبارکبادیوں اور حوصلہ افزائیوں نے انھیں ادب کے ساتھ جوڑنے اور ادبی کارنامے سرانجام دینے میں بہت بڑا رول ادا کیا۔انہوں نے اپنی پوری کاوش اور لگاتار جدوجہد سے ادب کی خدمت کی۔اپنی مزید مصروفیات کے باوجود بھی ادب کے ساتھ جڑی رہیں۔

مصنفہ نے اپنے افسانوی مجموعے کا نام اپنے ہی ایک افسانے ''کشمکش'' کے نام پر رکھا ہے۔یہ افسانوی مجموعہ دنیا کے کسی بھی حصے سے بہ ذریعہ انٹرنیٹ (http://www.lib.bazmeurdu.net) دستیاب ہے۔مصروفیات کی وجہ سے کبھی اسے شائع نہیں کرایا۔یہ افسانوی مجموعہ تیرہ افسانوں پر مشتمل ہے جس کی فہرست ذیل میں دی جارہی ہے:

1۔کشمکش

2۔پرچھائیں

3۔ڈائل ٹون

4۔نسل

5۔بین کرتی آوازیں

6۔انگلی کی پور پر گھومتا چاند

7۔کال بیلیا

8۔خوشبو

9۔ادراک

10۔تشنگی

11۔ایڈ ہیسو

12۔وہ نقش زیر آب ہے

13۔پرواہ کسے ہے!!!

اس افسانوی مجموعے کے علاوہ بھی مصنفہ کے کئی سارے افسانے ہیں جو ہندستان اور پاکستان کے متنوع رسالوں اور جریدوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

نسترن فتیحی ایک ہندستانی خاتون ہیں اور دو لڑکیوں کی ماں بھی ہیں اس لیے وہ خاتون کے جذبات کو بہت ہی اچھی طرح سے سمجھتی ہیں۔ان کے اکثر افسانوں میں یہ دیکھا گیا ہے کہ یہ عورتوں کو اپنے افسانے کا مرکزی کردار بناتی ہیں۔ان کے مسائل اور پریشانیوں کو قاری کے سامنے رکھتی ہیں۔سید صداقت حسین مصنفہ کے افسانوں اور اس کے ذریعے اٹھائے گئے موضوعات کے بارے میں اس طرح رقم طراز ہیں:

''جب آپ ٹھوس واقعات پر انحصار کرتی ایسی کہانی پر بات کرنا چاہیں گے جو کچھ کچھ باغی ہو، ذرا سی رومانی ہو، جس کے پہلو میں نفسیاتی الجھن کی جھن جھن ہو اور جو سماج سے کلی طور پر یوں جڑی ہو کہ اس کی صرف حقیقت ہی نہ کھلے بلکہ اس کے بخئے ادھیڑتی چلی جائے اور جو عورت ذات کے گنجل کھولنے کے لئے لکھی گئی ہو۔تو ایسے میں نسترن احسن فتیحی کا قلم اور اس کی لکھی سطروں کے بیچ عورت ایک اور روپ لے کر جلوہ گر ہوتی ہے۔ جو عورت کا حقیقی عکس قارئین ادب کے ذہنوں پر چھوڑتی ہے۔ان کا قلم سماجی بے قاعدگیوں پر پے در پے ضرب لگا رہا ہے۔اردو ادب میں تیزی سے افسانوی حیثت اختیار کرنے والی نسترن فتیحی نے برصغیر کے مرد بالا دستی والے سماج میں خواتین کے مساوی حقوق کا علم اٹھایا ہے اور اپنی تحریروں سے اسے ایک تحریک میں تبدیل کرتی نظر آتی ہیں،اور شاید اسی جزبے کے تحت پیش نظر کتاب وجود میں آئی، مجھے یقین ہے کہ اسے ادبی دنیا میں پزیرائی ملے گی۔نسترن احسن فتیحی نے بڑی سرعت سے اپنے افسانوں سے پہچان بنائی اور ہمیں ان کی تحریروں سے اندازہ ہوا کہ اپنے اطراف عورت کو محروم،محکوم اور مظلوم پا کر اسے مرد کے برابر ثابت کرنے کے لیے ان کا قلم تیزی سے گردش میں ہے۔ان کے افسانے ایک تحریک ہی نہیں بلکہ اردو ادب میں ستون کی حیثیت اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ کیونکہ وہ عورت اور مرد کی تخصیص ختم کر کے انسان کو انسان کی حیثیت سے دیکھنے کی خواہاں نظر

آتی ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ نسترن احسن فتیحی کا قلم عورت بالا دستی، حقوق نسواں
اور عورت پر جبر کے خلاف بھر پور قوت سے ان نا دید طاقتوں پر برستا رہے۔
تاوقتیکہ عورت سماج کی سب سے بڑی مزاحمتی دیوار بن کر انقلابات کا پیش خیمہ
ثابت ہو۔'' (2)

اب نسترن احسن فتیحی کے کچھ افسانوں کا مختصراً یہاں ذکر کیا جا رہا ہے تا کہ مصنفہ کی تصانیف کا اندازہ ہو سکے کہ وہ کس طرح کے افسانے لکھتی ہیں۔

تشنگی:

پورے اعتماد کے ساتھ لکھا ہوا مصنفہ کا یہ پہلا افسانہ ہے۔ اس افسانے میں مصنفہ نے دو لڑکیوں کا ذکر کیا ہے۔ پہلی ایک متوسط گھرانے کی ہے جو سفید رنگ اور بڑی بڑی آنکھوں والی خوبصورت لڑکی ہے۔ اس کے والد اپنے بچوں اور گھر کی ضرورتوں کو پوری کرنے کے لیے جدوجہد کرتا ہے۔ اسے پڑھنے اور اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کا شوق ہے۔ اس کی خوبصورتی کی وجہ سے بہت ساری امیر گھرانوں کی لڑکیاں بھی اس کی دوست تھیں جو اس کے ساتھ کالج میں زیر تعلیم تھیں۔ وہ جب اپنی امیر سہیلیوں سے ملتی اور انھیں مختلف لباس میں دیکھتی تو اپنی غربت کو یاد کرتی اور احساس کمتری کا شکار ہو جاتی۔ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتی تھی تا کہ وہ اچھی نوکری حاصل کر سکے اور غربت کے دلدل سے باہر نکل سکے۔ مگر معاشی کمزوری کے باعث اپنے مقصد کو پورا نہ کر سکی اور حالات سے سمجھوتا کر کے شادی کر لیتی ہے۔ اسے ایک اچھا چاہنے والا بلند کردار شوہر ملا جس کے ساتھ وہ خوش رہتی ہے۔ دوسری لڑکی امیر گھرانے سے تعلق رکھتی ہے اور وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے ایک امیر گھرانے میں ہی شادی کرتی ہے۔ اس کا شوہر عیاش پسند انسان ہے، اس کے پاس پیسوں کی کوئی کمی نہیں ہے، وہ ہر رات اپنے لیے ایک بیوی خرید سکتا ہے۔ اسے یہ محسوس ہو گیا کہ امیر گھرانوں میں صرف پیسوں کی کھنک ہوتی ہے خلوص اور محبت نہیں۔ اس لیے وہ اپنے شوہر سے علیحدگی اختیار کر لیتی ہے۔ اس افسانے میں مصنفہ نے یہ دِکھانے کی کوشش کی ہے کہ ایک عورت کے لیے اس کے شریک حیات کا اچھا ہونا ضروری ہے نا کہ اس کا امیر اور مالدار ہونا۔

کشمکش:

اس افسانے میں نسترن فتیحی نے ایک ایسے انسان کی حالت کو پیش کیا ہے جو اہل صبح دہلی جانے والی پہلی بس کو پکڑنا چاہتا ہے۔اس کے پاس وقت کی کمی ہے اور اسے بس اسٹینڈ تک پہچانے میں ایک بیمار رکشہ والے نے مدد کی ۔اس لیے اس نے رکشے والے کو بخشش دینے کا ارادہ کیا۔ وہ وقت پر پہنچ کر بس لینے میں کامیاب بھی ہو جاتا ہے مگر اس کے پاس رکشے والے کو دینے کے لیے کھلے پیسے نہیں ہوتے ہیں۔ وہ اسی کشمکش میں رہ جاتا ہے کہ وہ اس رکشے والے کو بڑا نوٹ دے یا نہ دے اور اسی دوران اس کی بس رفتار پکڑ لیتی ہے اور وہ رکشے والے کو اس کی مزدوری بھی نہیں دے پاتا۔

ڈائل ٹون:

اس افسانے میں مصنفہ نے ایسے انسان کی حالت بیان کی ہے جو ٹیلی فون میں ڈائل ٹون کے لیے سرکاری دفتر کا چکر کاٹتا ہے۔اسے صرف اس لیے ڈائل ٹون نہیں مل پاتا کیوں کہ وہ رشوت دینا پسند نہیں کرتا۔اسے پورا یقین ہے کہ اس کی محنت اور دوڑ بھاگ رنگ لائے گی اور وہ اس میں کامیاب ہو جائے گا۔اس کے لیے وہ گرمی کے موسم میں بھی کئی بڑے عہدے والے لوگوں سے ملتا ہے۔ایک دن جب وہ اپنے گھر آتا ہے اور ٹیلی فون میں ڈائل ٹون دیکھتا ہے تو اسے بے حد خوشی ہوتی ہے کہ اس کی محنت رائیگاں نہیں گئی۔ جب وہ اپنی بیوی کو فون پہ یہ بات کرتے ہوئے سنتا ہے کہ اس کی بیوی نے رشوت بھیجی ہے اسی وجہ سے ڈائل ٹون ملا ہے تو وہ اندر سے ٹوٹ جاتا ہے اور یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ آخر اس کے لیے وہ کسے قصوروار ٹھہرائے۔

انگلی کی پور پر گھومتا چاند:

اس افسانے میں نسترن احسن فتیحی نے ایک اکیلی بوڑھی ماں کی حالت کو بیان کیا ہے۔جس کے چار لڑکے ہیں اور وہ سبھی بیرونی ممالک میں اپنے بچوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ وہ بوڑھی عورت جسے عمر کے اس پڑاؤ میں پیسوں سے زیادہ اپنے بچوں کے ساتھ کی ضرورت ہے اسے نہیں مل پاتا ہے۔ وہ اپنے پوتوں اور بچوں سے دور تنہا گاؤں میں رہتی ہے اور اس کے پاس ایک موبائل ہے جس کا استعمال کرنا اس کے پوتے نے سکھایا۔اسی موبائل پر جب فیس بک میسنجر میں کوئی میسج آتا تو اس میں لگے بیٹوں اور پوتوں کی تصاویر کو اپنے انگلی سے چھو کر پیار کرتی ہے۔اس پیار اور

خلوص کو دور بیٹھے لوگ محسوس بھی نہیں کر سکتے۔اس پیار اور درد کو مصنفہ نے افسانے میں پیش کیا ہے۔

نسل:

اس افسانے میں نسترن فتیحی نے جنگل میں سکونت پذیر قبائلی لوگوں پر ہونے والے استحصال کو دکھایا ہے۔ اس میں ایک کم یاب نسل کے شیر کا شکار کسی شکاری نے کر دیا تھا اور شیرنی حاملہ تھی۔اس کو بچانے کے لیے پورے جنگل میں پولس کو تعینات کر دیا جاتا ہے۔قبائلی لوگوں کو جنگل خالی کرنے کا فرمان بھی دے دیا گیا۔اس لیے مجبوراً انھیں جنگل چھوڑ کر جانا پڑا۔ان ہی قبائلی لوگوں میں ایک اُنیس سالہ حاملہ لڑکی بھی ہے جو اس قابل بھی نہیں کہ وہ اپنے گھر سے باہر نکل سکے۔اس افسانے میں مصنفہ نے قاری کو یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ ایک انسان کے جان کی قیمت جانور سے بھی کم ہوگئی ہے۔جانور کو بچانے کے لیے سارا محکمہ لگا ہوا ہے اور انسان کے لیے بنیادی سہولیت بھی فراہم نہیں کی جا رہی ہے۔

پرواہ کسے ہے:

اس افسانے میں مصنفہ نے ایک ایسی عورت کی حالت کو پیش کیا ہے۔جو ایک نوکری پیشہ عورت ہے اور اسے نوکری کرنے کے علاوہ اپنے گھر کی ساری ذمے داریاں بھی پوری کرنی ہے۔اس کے گھر میں ایک بیمار ماں ہے، بچے ہیں اور شوہر بھی ہے۔اس کا شوہر ایک بےفکر انسان ہے۔اسے اپنے بیوی بچوں کی فکر نہیں،اسے اپنے دوستوں کے ساتھ باہر محفل جما کر بیٹھنا زیادہ پسند ہے۔ان سبھی وجوہات کی وجہ سے وہ عورت نوکری میں ملنے والی موقع کا فائدہ قابلیت ہونے کے باوجود بھی نہیں اٹھا سکتی ہے۔اور اسی وجہ سے وہ آج بھی کرائے کی آٹو سے ہی دفتر جاتی ہے۔ وہ حالات سے سمجھوتا کر لیتی ہے اور بس یہ سوچ کر خود کو اطمینان دیتی ہے کہ پرواہ کسے ہے؟۔

ایڈہیسو:

اس افسانے میں نسترن احسن فتیحی نے ایک نوکری پیشہ عورت کی حالت کو پیش کیا ہے۔جس کے آراستہ گھر میں کسی بھی چیز کی کمی نہیں ہے اگر کچھ نہیں ہے تو وہ فرصت کے چند لمحے جسے وہ اپنے شوہر اور بیٹے کے ساتھ بیٹھ کے کچھ حسین اور بےفکرے پل گزار سکے۔آج کل کی مشینی زندگی کو پیش کرتا ہوا یہ افسانہ ہمیں اس بات سے روبرو کراتا

ہے کہ ہم اتنی محنت اور مشقت کے بعد آرائش کا سامان لاتے ہیں مگر اسے استعمال کرنے کا وقت بھی ہمارے پاس نہیں ہے۔اس افسانے میں مصنفہ یہ بھی دِکھاتی ہے کہ جب عورت قناعت سے کام نہیں لیتی اور وہ اپنے گھریلو کام میں صرف اس لیے دلچسپی نہیں لیتی کیوں کہ اسے تعلیمیافتہ ہونے کا گمان ہے، وہ نوکری کرنا پسند کرتی ہے۔اس نوکری کے لیے وہ اپنے گھر کی بہت ساری چیزوں کوفراموش کر اپنا اصل مقصد نوکری کو ہی سمجھتی ہے۔اس کا نقصان صرف یہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنے گھر کے کاموں میں حصہ نہیں لے سکتی بلکہ وہ اپنے شوہراور بچوں کا بھی پوری طرح سے خیال نہیں رکھ پاتی اوراس طرح آہستہ آہستہ ان کے درمیان دوریاں بڑھتی جاتی ہیں۔ وہ ایک ایسے ایڈ ہیسو کی تمنا کرتی ہے جواس کے بکھرے ہوئے رشتوں کو جوڑ پائے،آپسی رنجشوں اور فاصلوں کوختم کر کےجسم و جان کی طرح مل جل کرر ہنے میں اس کی مدد کرے۔

سادہ اوراق:

اس افسانے میں نسترن فتیحی نے ایک ایسے بے روزگار لڑکے کی حالت کو پیش کیا ہے جو ایک اصول پسند انسان ہے۔ وہ اپنے گاؤں سے دہلی جیسے بڑے شہر میں نوکری کی تلاش میں آتا ہے۔دوسال گزر جانے کے باوجود بھی اپنے اصولوں کی وجہ سے اب تک بے روزگار گھوم رہا ہے۔کرائے کے مکان اور رہنے کے اخراجات کو پورا کرنے کے لیے وہ کہانیاں لکھتا ہے جسے کئی نامور مصنف اس سے خرید کر اپنے نام سے شائع کراتے ہیں۔اس افسانے میں مصنفہ نے گھوسٹ رائٹر کوموضوع بنا کر پیش کیا ہے۔قاری کو یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ آج کل کچھ مشہور مصنف وقت کی قلت کی وجہ سے یا کسی اور وجہ سے اس طرح کے گھوسٹ رائٹر سے اپنا کام کراتے ہیں۔

کال بیلیا:

اس افسانے کا نام نسترن احسن فتیحی نے خانہ بدوش قبیلہ کال بیلیا کے نام پر رکھا ہے۔اس افسانے میں مصنفہ نے یہ دکھایا ہے کہ آج کے اس تیز رفتار اور ترقی پسند زمانے میں بھی ہندستان کے کئی سارے ایسے علاقے ہیں جہاں لوگ آج بھی خانہ بدوشی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔اس قبیلے کے لوگ اپنی ثقافت اور طرز زندگی سے محبت کرتے ہیں۔اس سے اتنا لگاؤ ہے کہ اسے چھوڑنے کو بھی تیار نہیں۔ یہ لوگ شہر کے اندر سڑک اور ریل لائن کے

کنارے یا کسی کھلے میدان میں اپنی جھونپڑی اور کچا مکان بنا کر رہتے ہیں۔ یہ کھیل تماشا دکھا کر محنت مزدوری کر کے اپنے بچوں کی پرورش کرتے ہیں۔ شہری لوگ ان قبائلی لوگوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان کو اپنے ساتھ اٹھنے بیٹھنے نہیں دیتے۔ ان کا استحصال کرتے ہیں۔ اگر کہیں کسی چیز کی چوری ہو جاتی ہے تو انھیں مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ مصنفہ نے اس افسانے میں کال بیلیا قبیلے کے اوپر ٹھاکر کے استحصال کو دکھایا ہے۔ اس کا مرکزی کردار کال بیلیا قبیلے سے تعلق رکھنے والی ''نرملا جوگن'' ہے۔ اس کے باپ نے ٹھاکر کے بیٹے کو سانپ کا زہر نکال کرنئی زندگی دی تھی اور بدلے میں اس نے نرملا کی عصمت لوٹ لی۔ اس کے بھائی اور باپ کو ٹھاکر نے موت کے گھاٹ اتار دیا، اس صدمے سے اس کی ماں بھی چل بسی۔ نرملا جوگن بدلے کی آگ کو سینے میں دبائے موقعے کی تلاش میں رہتی ہے۔

خوشبو:

غربت اپنے آپ میں ایک بددعا ہے، اس کے ساتھ اگر یتیمی جڑ جائے تو یہ اس سے بھی بری ہو جاتی ہے۔ جب کوئی لڑکی ایسی حالت سے گزرتی ہے تو اس کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔ ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اس افسانے میں مصنفہ نے ایک یتیم اور غریب عورت ''جمنی'' کی زندگی کے حالت کو پیش کیا ہے۔ اس کی ماں ایک امیر گھرانے میں نوکری کرتی تھی اور اسی گھر میں وہ اپنی ماں کے ساتھ رہتی تھی۔ اس کی ماں جب کبھی بھی روٹی بناتی تو جمنی کو اس کی خوشبو مل جاتی اور وہ بھاگی بھاگی اپنی ماں کے پاس آتی اور ایک روٹی کھانے کو مانگتی۔ اس طرح جمنی کو روٹی کی خوشبو سے پیار ہو جاتا ہے۔ اس کی ماں کے انتقال کے بعد جمنی کی عمر انیس سال ہوتے ہی اس کی شادی ایک ٹیکسی ڈراؤر سے کرادی جاتی ہے۔ اس کے شوہر کو شراب نوشی کی عادت تھی وہ کما کر نہیں لاتا تھا۔ غربت کی وجہ سے اس کے حالات خراب ہوتے گئے اور جمنی کے جسم سے توانائی بھی جاتی رہی۔ اب وہ بیمار رہنے لگی تھی۔ شادی کے آٹھ سال بعد اس کی بیٹی للیا پیدا ہوئی وہ اب سولہ سترہ سال کی ہے۔ غربت کی وجہ سے اسے بھی بچپن سے ہی گھروں میں کام کرنا پڑتا ہے۔ جمنی کے گھر میں کئی دنوں سے روٹی نہیں بنی تھی اور وہ اس کی خوشبو کے لیے بے چین ہو رہی تھی ۔اسی بے چینی کو مصنفہ نے اس افسانے میں دکھایا ہے۔

پرچھائیں:

یہ ایک نیم علامتی افسانہ ہے۔اس افسانے میں مصنفہ نسترن احسن فتیحی نے ایک نوکری پیشہ عورت کی حالت کو دکھایا ہے۔اس میں عورت کے چار بچے ہیں دولڑکے اور دولڑکیاں۔سب اپنی اپنی زندگی میں مشغول ہیں یہ باہر نوکری کرنے کے باوجود بھی اپنے بچوں اور شوہر کا خیال رکھتی ہے مگر ان کے اپنے ہی اس کی قدر نہیں کرتے۔اس کے جذبات کو نہیں سمجھتے۔اس کے اس درد کو مصنفہ نے اس افسانے میں بیان کیا ہے۔

ناول نگاری:

معاصر فکشن نگاروں میں ایک اہم نام نسترن احسن فتیحی کا ہے۔اپنے ادبی سفر کی ابتدا فن افسانہ نگاری سے کی۔ ان کا پہلا افسانہ " تشنگی " ماہ نامہ'' شاعر'' ممبئی میں 1991 میں شائع ہوا۔اب تک ان کے درجنوں افسانے ہندستان ارو پاکستان کے مقتدر رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔افسانوں کے ساتھ ساتھ مصنفہ نے ناول کے میدان میں بھی اپنا ہنر دکھایا ہے۔ان کا پہلا ناول ''لفٹ'' 2003 میں منظر عام پر آیا اور مقبولیت حاصل کی۔اس کے علاوہ مصنفہ کا ایک اور ناول ''نوحہ گر'' زیر اشاعت ہے جس کا قارئین کو انتظار ہے۔

ہر عمدہ ناول اپنے عہد کی تہذیب وتمدن اور ثقافت کا عمدہ نمونہ اور بہترین عکاس ہوتا ہے۔اچھے ناولوں میں زندگی کے مختلف تجربات اور تحریکات کو تخلیقی جامہ پہنا کر اسے اس انداز میں پیش کیا جاتا ہے کہ ناول نگار قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور قاری کو ایک نئے تجربے سے روشناس کراتا ہے۔داستان کے بعد اردو ادب میں جس صنف نے اپنی پہچان بنائی ہے وہ ناول ہی ہے۔اور مسلسل تغیر پذیر ہوتے ہوئے موجودہ شکل تک پہنچی ہے۔ فن پارے کی طرح ناول کی بھی اپنی ایک تاریخ ہے جو عظیم فن پارے داستان کے ذریعے تشکیل پائی ہے۔ ہر اچھا ناول اپنے عہد،تاریخ تہذیب وتمدن کا بہترین عکاس ہوتا ہے ناول کے مطالعہ سے ہمیں اس دور کے عہد،تہذیب وثقافت،زبان اور بولی کا پتہ چلتا ہے۔ناول کے فن سے متعلق مصنفہ نسترن احسن فتیحی ناول لفٹ کے "دو باتیں" میں لکھتی ہیں:

> "۔ناول کے فن کے حوالے سے بس اتنا ہی کہونگی کہ میری نظر میں ناول کی تخلیق کا معاملہ کسی بھی سماج کی خارجی کروٹوں سے کہیں زیادہ اس کے اندر ہی اندر رواں تہذیبی لہروں سے جڑا ہوتا ہے۔ یہ تو مانا جا سکتا ہے کہ کسی سماج میں

آنے والی ثقافتی تبدیلیاں کسی تخلیق کار کو وہ تخلیقی توانائی فاہم کرتی ہیں جو ایک تخلیق کی شکل میں ابھر کر سامنے آتی ہے۔ یہ ثقافتی مظاہر، تخلیقی عمل کی وجہ بنتے ہیں۔ انسانی حیات اور اس کے تہذیبی حوالوں سے جڑی ہوئی کہانیاں، ہمیشہ قاری کو متوجہ کرتی ہیں کیونکہ یہ کہانیاں اپنے عہد کے طرز احساس کو اپنے وجدان سے چھوتی ہیں۔ ثقافتی تبدیلیوں کو تخلیق کار زمان ومکاں کے حوالے سے اپنی تخلیقی آنکھ سے دیکھتا ہے اور پھر اسے یوں بیان کرتا ہے کہ آپ بیتی جگ بیتی معلوم ہونے لگتی ہے۔ لفٹ میں میں نے نہ صرف اپنے باہر کے ماحول اور ثقافتی تبدیلیوں کو اپنی باطنی ذات کا حصہ بنایا ہے بلکہ ثقافتی تبدیلیوں کو اپنی تخلیقی ذات میں یوں پیوست کرنے کی کوشش کی ہے کہ ثقافتی تبدیلیاں قدم قدم پر اپنی جھلک دکھا سکیں۔" (3)

نسترن احسن فتیحی کا پہلا ناول ''لفٹ'' 180 صفحات پر مشتمل ہے اور ناول نگار نے اسے آٹھ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ اس کے ہر باب میں ایک عنوان درج ہے۔ ہر ایک عنوان آنے والے واقعات وحادثات کا اشارہ کرتا ہے۔ مثلاً ناول کا آٹھواں اور آخری باب جس کا عنوان ''ہیلو پروفیسر!...'' ہے جس میں موجودہ دور کی جوڑ توڑ کی سیاست کو بہترین ڈھنگ سے پیش کیا گیا ہے۔ نیک رام جسے اجے ورما نے پہلی بار ریزرو پوسٹ پر آسانی سے یونی ورسٹی میں بطور کلرک کی پوسٹ پر بحال کیا تھا۔ وہ جوڑ توڑ اور دلت سیاست کا فائدہ اٹھا کر اجے ورما جیسے قابل اور حقدار کو پیچھے چھوڑتے ہوئے اسی یونی ورسٹی کا وائس چانسلر بن جاتا ہے۔ اجے ورما اس سے ملاقات کرنے سے گریز کرتا رہتا ہے مگر ایک دن نیک رام کی ملاقات اجے ورما سے صبح یونی ورسٹی کیمپس میں سیر کے دوران ہو جاتی ہے۔ نیک رام اپنی کار سے اتر کر اجے ورما کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا اور کہا " ہیلو پروفیسر....۔" اس ناول میں مصنفہ نے بہترین ڈھنگ سے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ سہارے کے سامنے صلاحیت دم توڑ دیتی ہے اور زندگی میں آگے بڑھنے کے لیے صلاحیت سے زیادہ سہارے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ ناول لفٹ کے بارے میں صغیر افراہیم یوں رقم طراز ہیں:

''ناول کا فن جملے اور واقعات گڑھنے کا فن نہیں ہے۔ یہ ایک پختہ کار تخلیقی شعور رکھنے والے فنکار کا شعوری اور منصوبہ بند عمل ہے اور یہ تخلیقی عمل ''لفٹ'' میں کامیابی سے ہم کنار ہوا ہے۔ نسترن فتیحی نے اپنے اس ناول میں اس خاص

فضا، ماحول اور مقام کی تشکیل وترتیب کوملحوظ رکھا ہے۔جس کا انہوں نے براہ راست تجزیہ ومشاہدہ کیا تھا۔اسی مناسبت سے ''لفٹ'' کیمپس ناول قرار پاتا ہے۔ چونکہ مصنفہ نے ایک محدود مگر خاص ماحول میں ڈوب کر سراب زندگی کے نتائج اخذ کئے ہیں اس لئے پیش کش کا انداز اوران کا برتاؤ نہایت موثر، گھر کرنے ولا اور چھا جانے والا ہے۔

اردو کے اس کامیاب کیمپس ناول میں خوارتین کے حقوق کی بحالی، ان کے سماجی منصب کے تعین اورانفرادیت کو بالواسطہ طور پر اس طرح چھوٹے چھوٹے جملوں میں موضوع بحث بنایا ہے کہ ''لفٹ'' تانیثی عزائم کی غیر روایتی مثال بن کر سامنے آیا ہے۔

میں اس اہم ناول کی دوسری اشاعت پر نسترن فتیحی کو دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں''۔(4)

ناول لفٹ بھی ایک طرح سے اپنے عہد کا بیانیہ ہے۔ بظاہر اس کا بیانیہ سادہ ہے جو یونی ورسیٹی کے پروفیسر اجے ورما اوراس کے شاگرد بیتا کے گرد گھومتا ہے۔ یہ ناول وقت کے ساتھ ہندستان کے ماضی، حال اور مستقبل کی داستان سناتا ہے۔اس ناول کو شائع ہوئے ڈیڑھ دہائی سے زیادہ ہوگیا۔ یہ ناول موجودہ حالات کے ساتھ مستقبل کا بھی علم دیتا معلوم ہوتا ہے۔ ناول کو عصری زندگی کا رزمیہ کہا جاتا ہے۔نسترن احسن فتیحی کا ناول بھی انسانی زندگی کا بہترین رزمیہ ہے۔ یہ ناول یونی ورسٹی کی تعلیمی اور تاریخی پس منظرا کا عمدہ بیانیہ ہے۔ ناول کے بارے میں غضنفر یوں رقم طراز ہیں:

''پچھلے پندرہ بیس برسوں میں جن چند خواتین فکشن نگاروں نے صفحہء قرطاس پر اپنے تخلیقی خون کی گردشوں کا رنگ دکھایا اور اہل نقد و فن کو متوجہ کیا ان میں نسترن احسن فتیحی بھی ایک ہیں۔نسترن فتیحی نے یوں تو کامیاب اور قابل قدر افسانے بھی لکھے مگر جس فن پارے نے نگاہوں میں اپنا عکس گہرا کیا اور ذہن و دل میں محسوسات و مشاہدے کا لہوا تارنے میں کامیاب ہوا وہ ان کا ناول 'لفٹ ہے'

'لفٹ' ۲۰۰۳ء میں تیار ہوئی، مگر آج بھی روز اول کی طرح تازہ و توانا اور
رواں دواں ہے۔

یہ لفٹ زندگی کی ان منزلوں تک لے جاتی ہے جہاں بدلا ہوا وقت اپنا بھیانک اور مکروہ چہرہ لئے کھڑا ہے۔ جہاں انسانی تمدن کی شکست و ریخت کی کرچیاں بکھری پڑی ہیں۔ جہاں منظر، پس منظر اور پیش منظر تینوں لہولہان ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ میں آپ کے اور لفٹ کے درمیان حائل رہوں اس لئے ہٹتا ہوں۔ خود بٹن دبائیے اور دیکھئے کہ یہ لفٹ آپ کو کہاں کہاں لے جانا چاہتی ہے اور کیا کیا دکھانا چاہتی ہے اور آپ سے کیا کیا کہنا چاہتی ہے۔'' (5)

تنقید و تحقیق:

اردو زبان کے ادیبوں نے اکثر و بیشتر مغرب کے ادیبوں اور ناقدوں کی تقلید کی ہے اور پھر آگے چل کر اردو ادب کے لیے اپنی راہ بنائی ہے۔ ایسا بہت ہی کم ہوا ہے کہ اردو ادب کے ناقدوں اور ادیبوں نے خود سے کوئی نئی راہ بنائی ہو جس کی تقلید مغرب کے ادیبوں نے کی ہو۔ اردو ادب میں ایسی کتابیں بہت ہی کم دیکھنے کو ملتی ہیں جو بدلتے ہوئے زمانے اور حالات کے ساتھ پیدا ہوئے مسائل کا احاطہ کرتی ہوئی وقت کے ساتھ چلتے ہوئے قاری کے سامنے ان مسائل کو رکھتی ہو۔ ایسی کچھ کتابیں اگر ہمیں مل بھی جاتی ہیں تو وہ اکثر کسی دوسری زبان کا ترجمہ کیا ہوا ہوتا ہے یا پھر کسی بیرونی ملک کی زبان میں لکھی گئی کتاب سے متاثر ہو کر اس کا چربہ بیان کیا ہوا ہوتا ہے۔ ایسی کتابیں اکثر اس طرح ترجمہ کی ہوئی ہوتی ہیں کہ قاری اس سے استفادہ حاصل کرنے کے بجائے لفظوں اور معنوں کے بھنور میں ہی پھنس کر رہ جاتا ہے۔ اس طرح نہ تو کتاب لکھنے والا اپنے مقصد میں کامیاب ہوتا ہے اور نہ ہی پڑھنے والا اس سے کچھ حاصل کر پاتا ہے۔ اردو ادب میں بھی کچھ ایسے لکھنے والے لوگ ہیں جو عام روایت سے ہٹ کر اپنی نظروں اور سوچ کو وسیع کر کے نہ صرف اپنے آس پاس ہونے والے ماحول میں تبدیلیوں کو دیکھتے ہیں بلکہ اس دنیا کے دوسرے ممالک اور عالمی سطح پر ہو رہی تبدیلیوں پر بھی باریک نظر رکھتے ہیں۔ اپنے عمیق مشاہدے کا استعمال کر نئے نئے موضوعات کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔ ان موضوعات پر غور و فکر کرنے کے بعد اپنی علمی دسترس کے بنا پر کتابیں اور مضامین لکھتے ہیں۔ جسے دلچسپی کے ساتھ پڑھ کر قاری مستفید بھی ہوتے ہیں۔ مصنفہ کی تصانیف کے بارے میں خورشید حیات

یوں رقم طراز ہیں:

''ڈاکٹر نسترن احسن فتیحی ،ادب زندگی کی "بانگتی" کا نام ہے۔
نام ہے اُس تنقیدی اور تحقیقی ذہن کے تخلیقی بہاؤ کا جہاں ندی سے ندیوں اور نہروں کے سلسلے آگے بڑھتے ہیں۔
نسترن احسن فتیحی ایک ایسی ادیبہ کا بھی نام ہے جو نئی صدی کی تیز رفتار زندگی اور زرد پتّوں کی بارشوں میں سُنہری چٹائی تہذیب کی سہیلی بنی ہوئی ہیں۔ نسترن فتیحی اپنی تخلیق وتنقید میں جدید حسیات، لفظیات اور فنی پختگی کے ساتھ رُوحوں میں ابدی حُسن کی ایک نئی دنیا بسانے کا کام بڑی خاموشی سے کر جاتی ہیں۔'' (6)

مصنفہ کی کتاب ''ایکوفیمینزم اور عصری تانیثی اردو افسانہ'' بھی اسی کم یاب کتابوں کی فہرست میں رکھی جاسکتی ہے جو عام روایت سے ہٹ کر مصنفہ نے اپنے عمیق مشاہدے اور علمی دسترس کے بنا پر لکھی ہے۔ اس کتاب کے نام سے ہی یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ اس کتاب میں کس موضوع پر بحث کی گئی ہے۔ اس کتاب کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اس کے اندر ماحولیاتی مادریت اور تانیثیت جیسے مسائل کو عصری تانیثی افسانوں جو عصر حاضر کے خواتین ادیبوں کے ذریعے لکھے گئے ہیں اس کے حوالے سے پرکھنے اور تحقیق کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے لیے مصنفہ نے ہندستان کے علاوہ کئی مما لک میں مقیم خاتون کے افسانوں کو اس کتاب میں زیر بحث موضوع کے حساب سے منتخب کیا ہے۔ اس سے اس کتاب کی زینت بڑھی ہے اور قاری کو ان مسائل کو اچھی طرح سمجھنے میں بھی مدد ملی ہے۔ مصنفہ اس کتاب کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں۔

''ایکوفیمینزم "یا ماحولیاتی مادریت کی نظریاتی اور سماجی تحریک نے عورت اور مرد کو یکسانیت کے خانے میں رکھ کر ان دو مختلف جنسوں کے قدرتی اور ذاتی فرق کو واضح کیا ہے۔ ایکوفیمینزم کے اس نظریہ میں عورت اور مرد انسانی لحاظ سے برابر ہیں لیکن جسمانی اور جذباتی لحاظ سے مختلف۔ بعض معاملات میں مختلف حقوق اور مزاج کے حامل ہیں ایکوفیمینزم "یا ماحولیاتی مادریت کی یہ اصطلاح بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، "ایکوفیمینزم" کی یہ اصطلاح دراصل "ماحولیاتی تنقید" یعنی "ایکوکرٹسزم" (Eco-criticism) کی ایک ذیلی شاخ ہے۔'' (7)

اس کتاب کولکھنے کے پیچھے مصنفہ کا جو مقصد تھا اس میں وہ حتیٰ الامکان کامیاب بھی ہوئی ہیں۔ اس کتاب کو لکھتے وقت مصنفہ نے کبھی بھی اپنی ذاتی خیال کوترجیح نہیں دی ہیں، وہ ہمیشہ اس کوشش میں رہیں کہ ایک عام پڑھا لکھا انسان اس مسئلہ کو جسے مصنفہ نے اپنی کتاب میں زیر بحث لایا ہے اسے کس نظریہ سے دیکھے گا۔ اب یہ قاری پر ہے کہ وہ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد اس سے کیا حاصل کرتا ہے۔؟ کیا وہ اپنی زندگی کو اسی رواروی میں گزارتا رہے گا جیسا وہ اس کتاب کو پڑھنے سے پہلے گزارتا تھا یا پھر وہ بھی مصنفہ کی سوچ کے ساتھ آگے بڑھے گا۔ اس کتاب کو لکھنے کی ضرورت مصنفہ کو کیوں پڑی اس کے بارے میں مصنفہ یوں رقم طراز ہیں۔

''ادبی مطالعے میں ماحولیاتی تنقید کی ضرورت اس وقت پیش آئی جب انسان سے اپنی ضروریات کے پیش نظر دنیا کی ساری چیزوں کو زیرتصرف کر دیا۔ ان اشیا میں جاندار بھی ہیں اور بے جان بھی۔ ایک جرثومہ (بیکٹریا) سے لے کے سورج جیسے فلکی اجسام سبھی انسان کی خدمت اور نفع رسانی کے لیے تخلیق کیے گئے ہیں۔ شجر، حجر، معدنیات، ہوا، پانی، جنگلات، قدرتی وسائل، حیوانات، چرندو پرند اور خود انسان اس عظیم ماحول کا حصّہ ہیں۔ جب تک ماحول کے یہ اجزا فطری انداز میں ایک دوسرے سے روبہ عمل رہے، قدرت یا فطرت کا توازن ٹھیک ٹھاک رہا۔ ماحول کا اثر انسان کی جسمانی بناوٹ، رہائش، طرز حیات، غذا اور دیگر سرگرمیوں پر پڑتا ہے۔ یہ ساری چیزیں جب تک فطری انداز میں رہیں ساری دنیا کا نظام معمول کے مطابق رہا اور انسان اپنے ماحول سے پوری طرح فیضیاب ہوتا رہا۔ مگر بڑھتی ہوئی آبادی سائنسی انکشافات کے غلط استعمال اور انسانی ہوس نے قدرت میں دراندازی شروع کر دی۔ زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی لالچ میں یہ استحصال بڑھتا گیا۔'' (8)

نسترن احسن فتیحی نے اس کتاب کو تین ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ باب اول ایکوفیمینزم (ماحولیاتی تانیثیت)۔ باب دوم عصری تانیثی اردو افسانہ اور ایکوفینمیزم کا تصور۔ باب سوم ماحولیاتی تانیثیت اور عصری تانیثی افسانے کا ایک تجزیاتی مطالعہ۔ اب ہم ہر ایک باب کا مختصراً جائزہ لیتے ہیں۔

باب اول: ایکوفیمینزم (ماحولیاتی تانیثیت)

اس باب میں نسترن احسن فتیحی نے ہر طرح کے استحصالی رویہ کو پدرسری کہا ہے۔خاتون ہمیشہ سے زبراور استحصال کے خلاف آواز اٹھاتی رہی ہے جسے مغرب کی تاریخ کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔انقلاب انگلستان اور خواتین،انقلاب فرانس اورخواتین،برطانیہ میں مزدورتحریک اورخواتین،انقلاب روس اورخواتین۔اس کے علاوہ تیسری دنیا کے پدرسری سماجی ماحول کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ایکوفیمینزم اور ماحولیاتی تنقید کا تعارف اوران کا آپسی رشتہ بتایا گیا ہے۔ایکوفیمینزم بحیثیت ادبی تنقید میں ادب سے اس کا تعلق بتایا گیا ہے۔فیمینزم،پہلی تانیثی لہر،دوسری تانیثی لہراورتانیثی تحریک کی تیسری لہرکو بھی اس میں پیش کیا گیا ہے۔ماحولیات کو زیر بحث رکھا گیا ہےاس میں فضائی آلودگی،پانی کی آلودگی،صوتی آلودگی کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ماحولیات سے خاتون کی وابستگی اس میں خاتون کا ماحول سے رشتہ دکھایا گیا ہے۔ماحولیاتی آلودگی اورعوامی تحریکیں اس میں چپکوتحریک،گرین بیلٹ تحریک،کینگ شی آن گرین پروجکٹ تحریک،نودانیہ تحریک،فری گین ازم کے ذریعے ماحول کی حفاظت کی ضرورت بتایا گیا ہے۔ لوک ادب اور ماحولیات،اردوادب میں ماحولیات کے ذریعےادب میں ماحول پیش کیا گیا ہے۔

باب دوم: عصری تانیثی اردوافسانہ اورایکوفینمینزم کا تصور

اس باب میں مصنفہ نے فکشن کی مختصرتعریف کی ہے۔اردوادب میں فکشن کی تعریف پروفیسرآل احمد سروراور شمس الرحمٰن فاروقی کے حوالے سے کی ہے۔پھر قرۃالعین حیدراور زاہدہ حنا کے افسانوں میں ماحولیاتی مادریت کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔مصنفہ نے اس باب میں دورحاضر کے انیس خاتون افسانہ نگاروں کے ایسےافسانوں کا انتخاب کیا ہے جو ایکوفیمینزم کے پیمانے کو پورا کرتے ہیں۔ان میں بہت سارے ہندستان کے باہر دوسرے ممالک میں سکونت رکھتے ہیں۔مصنفہ کے اس کتاب میں مندرجہ ذیل افسانے شامل کیے گئے ہیں۔

1۔کتن والی،مصنفہ۔سبین علی،مقیم۔جدہ سعودی عرب،آبائی وطن۔لاہور پاکستان

2۔عشق پیچاں،مصنفہ۔سلمٰی جیلانی،مقیم۔نیوزی لینڈ،آبائی وطن۔پاکستان

3۔مجسّمہ،مصنفہ۔ترنّم ریاض،مقیم۔نئی دہلی،آبائی وطن۔سری نگر ہندستان

4۔کنول پوش اور تاجر،مصنفہ۔عینی علی مکمل نام قرۃالعین علی،مقیم ۔جدہ سعودی عرب، آبائی وطن ۔ لاہور پاکستان

5۔شکنتلا،مصنفہ۔غزال ضغیم ،مقیم ۔لکھنؤ،آبائی وطن ۔لکھنؤ ہندستان

6۔اہتمام،مصنفہ۔ڈاکٹر کوثر جمال،مقیم ۔سڈنی آسٹریلیا،آبائی وطن ۔ پاکستان

7۔ چراغ آفریدم،مصنفہ۔نسیم سید،مقیم ۔کنیڈا،آبائی وطن ۔ پاکستان

8۔بوگن ویلیا کی اوٹ سے،مصنفہ۔عذرا نقوی،مقیم ۔دہلی،آبائی وطن ۔ ہندستان

9۔ایکوریم،مصنفہ۔نگار عظیم،مقیم ۔دہلی،آبائی وطن ۔مرادآباد ہندستان

10۔صدیوں نے سزا پائی،مصنفہ۔انجم قدوائی،مقیم ۔علی گڑھ،آبائی وطن ۔لکھنؤ ہندستان

11۔بیل فلاور،مصنفہ۔ڈاکٹر نکہت نسیم،مقیم ۔سڈنی آسٹریلیا،آبائی وطن ۔ پاکستان

12۔پانچواں موسم،مصنفہ۔شاہین کاظمی،مقیم ۔سوئٹزرلینڈ،آبائی وطن ۔ پاکستان

13۔وجود،مصنفہ۔سیمیں درّانی،مقیم ۔کراچی پاکستان،آبائی وطن ۔ پاکستان

14۔نسل،مصنفہ۔ڈاکٹر نسترن احسن فتیحی،مقیم ۔علی گڑھ ہندستان،آبائی وطن ۔سمستی پور ہندستان

15۔ماں پیڑ اور چھاؤں،مصنفہ۔ڈاکٹر ناہید اختر،مقیم ۔راول پنڈی پاکستان،آبائی وطن ۔ پاکستان

16۔اسنو مین،مصنفہ۔نورالعین ساحرہ،مقیم ۔امریکہ،آبائی وطن ۔ پاکستان

17۔نیم کا پیڑ،مصنفہ۔شہناز یوصف،مقیم ۔اودے پور ہندستان،آبائی وطن ۔ ہندستان

18۔گوہر فروش،مصنفہ۔رومارضوی،مقیم ۔کوالالمپور ملیشیا،آبائی وطن ۔اسلام آباد پاکستان

19۔منّت،مصنفہ۔صادقہ نواب سحرؔ،مقیم ۔ممبئ،آبائی وطن ۔گنٹور ہندستان

باب سوم ماحولیاتی تانیثیت اور عصری تانیثی افسانے کا ایک تجزیاتی مطالعہ

اس باب میں نسترن فتیحی نے دوسرے باب میں لیے گئے افسانوں اور افسانہ نگار کے دوسرے ایسے افسانوں کا مختصراً تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے جو ایکوفیمینزم سے مماثلت رکھتا ہے۔

اس طرح یہ کتاب تین سو چار صفحات پر مشتمل ہو گیا اس کی ضخامت کو لے کر مصنفہ فکر مند تھیں کہ کہیں قاری

اس سے بچنے کی کوشش تو نہیں کرے گا۔انھیں یہ بھی یقین تھا کہ انہوں نے اتنی محنت اور مشقت کے بعد اس کتاب کو لکھا ہے،اسے اس طرح لکھا ہے کہ قاری اس کتاب کو پڑھتے وقت خود ہی کتاب کی گرفت میں آ جائے گا اور اسے پورے انہاک کے ساتھ مکمل پڑھے گا اور قاری کے لیے اس کتاب کی ضخامت کوئی معنی نہیں رکھے گی۔مصنفہ نے اس کتاب کو لے کر کہیں بھی یہ دعویٰ نہیں کیا ہے کہ ماحولیاتی مادریت اور تانیثیت جیسے سنگین مسئلے کے موضوع پر ان کی پہلی کتاب ہے۔حقیقت یہ ہے کہ اس موضوع پر اردو ادب کے حوالے سے ان سے پہلے کسی نے بھی کتاب نہیں لکھی اس لیے مصنفہ کے اس قدم پر وہ مبارکباد کی مستحق ہیں۔خورشید حیات اس کتاب کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

> پرندوں کی سانسیں جب رُکنے لگیں، مچھلیاں جب ریت پر چھٹپٹانے لگیں، درختوں کی جڑیں جب کولتار کی سڑکوں کے کنارے سکڑنے لگیں اور سیمنٹ۔کنکریٹ۔ریت کے گملوں میں چھوٹے قد کے اپاہج سے دیکھائی دینے والا درختوں نے جگہ لے لی تو ماحولیات پر خواتین کے قلم سے نکلنے والے کلونجی صفت حروف نے کہانیوں کی صورت اختیار کر لی۔ ہمیشہ "فیل گڈ" کی کیفیتوں کے ساتھ، ماضی کی طرف پیٹھ کر کے، آگے بڑھنے والی بھیڑ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں کرتی ہے نسترن فتیحی کی یہ "صدی کتاب"
>
> خود کو ذہنی اور سماجی سطح پر تنہا محسوس کرنے والے حساس ماٹی بدن تخلیقی فنکار کے احساس کی فصیل میں زخمی ہوئے بدن کا اظہار یہ ہے یہ کتاب!
>
> ایک طرف جہاں بعض افسانہ نگاروں کو عورت بدن کی جمالیات کے بہانے لار ٹپکانے سے فرصت نہیں ملتی وہیں دوسری طرف نئی صدی کی خواتین قلم کار تیزی سے بدلتے موسموں کے مزاج کو پڑھنے میں مصروف دکھائی دیتی ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ نسترن فتیحی کی اس کتاب کا فتح الباب، خواتین قلم کار کے نام ہے کہ ان کے قلم سے نکلنے والے حروف سے زمزمے بہتے ہیں۔(9)

ڈاکٹر نسترن احسن فتیحی کی تنقید و تحقیقی کتاب "ایکوفیمینزم اور عصری تانیثی اردو افسانہ" کے مطالعے سے یہ بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ مصنفہ اپنی باریک بینی نظروں سے اس ماحول میں کہاں تک دیکھتی ہیں اور اپنے مشاہدے اور ذہنی علوم سے موضوع کا انتخاب کرتی ہیں۔قاری کو ان ساری باتوں سے روبرو کراتی ہیں جس کا علم قاری کو شاید

اس کتاب کے مطالعے سے پہلے نہیں تھا۔اس کتاب میں ماحولیاتی آلودگی کے برے اثرات کے بارے میں تفصیل سے بتایا گیا ہے۔کس طرح یہ آلودگی ہمارے ماحول کو برباد کررہی ہے، ہماری زندگی میں کن کن مشکلات کو دعوت دیتی پھر رہی ہے۔اس سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنے ماحول کو صحیح کریں۔عورتوں کو پھول اور پودوں سے بہت پیار ہوتا ہے۔انھیں جہاں کہیں بھی جگہ اور موقع ملتا ہے وہ اسے لگا دیتی ہیں۔گھر کے بالکونی میں، ٹیرس پر اور چھتوں پر یہاں تک کے کمروں میں بھی عورتیں گملوں میں پھول اور ہرے پودے لگا دیتی ہیں۔اپنے گھر کے کاموں کی مصروفیت سے وقت نکال کر وہ اس کا خیال بھی رکھتی ہیں۔

مصنفہ کی یہ کتاب قابل ستائش ہے۔اس میں مصنفہ نے اپنی بات کو واضح کرنے کے لیے کچھ لوگوں کے اقتباسات بھی دیے ہیں مگر اس میں کہیں کہیں وہ اس کا حوالہ دینا بھول گئی ہیں۔

حواشی

(1) ڈاکٹرنسترن احسن فتیحی، شخصی انٹرویو، 20فروری2018وقت4:00P.M

(2) نسترن احسن فتیحی، ایکوفیمینزم اورعصری تانیثی اردوافسانہ پہلا ایڈیشن، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی، فلیپ

(3) نسترن احسن فتیحی، لفٹ ناول (دوسرا ایڈیشن)، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی، ص6

(4) ایضاً (فلیپ)

(5) ایضا

(6) خورشیدحیات، فیس بک پوسٹ، 3جولائی2016

https:m..facebook.com/story.php?story_fbid=1390979940917237&id=100000157344033

(7) نسترن احسن فتیحی، ایکوفیمینزم اورعصری تانیثی اردوافسانہ پہلا ایڈیشن، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی، ص39

(8) ایضاً، ص40-41

(9) خورشیدحیات، فیس بک پوسٹ، 3جولائی2016

https:m..facebook.com/story.php?story_fbid=1390979940917237&id=100000157344033

ناول ''لفٹ'' اور افسانوی مجموعہ ''کشمکش'' کا مطالعہ

فکشن

اردو ادب کے فنون میں فکشن بھی ایک فن ہے۔اردو میں فکشن لفظ انگریزی کے لفظ Fiction کو ہو بہو استعمال کیا جاتا ہے۔دراصل انگریزی میں یہ لفظ لاطینی زبان کے Finges سے بنا ہے جس کا معنی ہے بنانا۔اردو میں فکشن کا مترادف افسانوی ادب ہے مگر کثرت سے استعمال کی وجہ سے انگریزی کا لفظ فکشن ہی اردو میں مستعمل ہونے لگا ہے۔فکشن لفظ کو اردو میں استعمال کرنے کے بارے میں پروفیسر آل احمد سرور یوں رقم طراز ہیں:

> ''فکشن کا لفظ ناول اور افسانہ دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔اردو میں فکشن کے لیے افسانوی ادب کی اصطلاح بھی برتی گئی ہے مگر چونکہ افسانہ ہمارے یہاں مختصر افسانے کے لیے مخصوص ہو گیا ہے۔اس لیے افسانوی ادب کہا جائے تو پڑھنے والے کا دھیان مختصر افسانے کے سرمائے کی طرف جائے گا۔ہم نہ صرف شارٹ اسٹوری کے لیے مختصر افسانے کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں ۔ بلکہ لانگ شارٹ اسٹوری کے لیے طویل افسانے کی اصطلاح بھی برتتے ہیں۔اس لیے میرے نزدیک ناول اور افسانہ دونوں کے سرمائے کے لیے فکشن اور فکشن کا ادب استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔انگریزی کی ایسی اصطلاحیں جن کے مترادف الفاظ ہمارے یہاں نہ ہوں اور جو ہمارے صوتی نظام کے مطابق ہوں، انہیں بجنسہ لے لینے میں تامل نہیں کرنا چاہیے''(1)

فکشن کے فن میں داستان، ناول، ناولٹ، ڈرامہ، افسانہ، مختصر افسانے کو شامل کیا جاتا ہے۔کچھ نقاد فکشن میں ان مثنویوں کو بھی شامل کرتے ہیں جس میں کہانی اور قصہ پن پایا جاتا ہے۔اس ضمن میں ارتضٰی کریم یوں رقم طراز ہیں:

> ''ایسی تحریر جس میں کسی واقعہ، کہانی یا افسانے کو بیان کیا جائے فکشن کے زمرے میں آئے گی اسی لئے اس کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے۔اس میں حکایت بھی شامل ہے اور تمثیل بھی۔داستان، ناول اور افسانہ (طویل یا مختصر) بھی، ناولٹ بھی اور ڈرامے بھی۔ یہاں تک کہ منظوم داستانیں بھی اور ایسی مثنویاں بھی جن میں قصّہ پن کا عنصر ملتا ہے۔''(2)

ناول ’’لفٹ‘‘

قصہ سننا اور سنانا انسان کی فطرت میں شامل ہے، جب انسان کو فرصت تھی تو وہ ایسے قصے پسند کرتا تھا جو جلدی ختم نہ ہو جس میں خیالی دنیا کی باتیں ہوں جس میں جنوں، پریوں، دیووں، بادشاہوں، شہزادوں اور شہزادیوں کا ذکر ہو۔ جس میں طوالت ہو اور جس میں خیالی دنیا کی خوب سیر کی جائے ایسے قصے کو داستان کہتے ہیں۔ داستان اس لیے مقبول ہوئی کہ انسان اس میں اپنی زندگی کے مسائل سے دور خیالی زندگی میں سکون تلاش کرتا تھا۔ اردو میں سب سے پہلے داستان نگار کی حیثیت عطا حسین تحسین کو اس کے داستان "نوطرز مرصّع" سے حاصل ہے۔

جب زمانہ بدلا تب وقت کے ساتھ انسان کے شعور میں پختگی بھی آنے لگی، اسے یہ محسوس ہوا کہ داستان کی خیالی وفرضی باتوں سے اسے کیا فائدہ؟ اسے اپنی اصلی اور حقیقی دنیا کی باتیں کرنی چاہیے اور سننی چاہیے۔ وہ ایسے قصے سنے جو اصلی دنیا سے جڑے ہوں اور جنھیں پڑھنے سے اصلی دنیا کو سمجھنے میں مدد ملے۔ جب لوگوں کی مشغولیت بڑھی اور فرصت کے لمحات کم ہونے لگے تو غیر ضروری طوالت کو ختم کیا جانے لگا اور اس طرح ناول وجود میں آیا۔ اردو میں ناول 1857 کے غدر کے بعد لکھا گیا۔ سب سے پہلے ناول نگار کی حیثیت ڈپٹی نذیر احمد کو اس کے ناول " مراۃ العروس" کو حاصل ہے حالاں کہ اس میں بہت سارے نقادوں کو اعتراض بھی ہے۔ ناول کی تعریف سے متعلق وقار عظیم یوں رقم طراز ہیں:

> ’’ناول کے نقادوں اور ناول نگاروں نے ناول کی جو متعدد تعریفیں کی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ "ناول زندگی کی وسعتوں کا حامل ہے"۔ یعنی زندگی کو اس طرح ادب کے سانچے میں ڈھالنا کہ اس کی ساری وسعتیں اور گہرائیاں اس سانچے میں سما سکیں، ادب کی کسی اور صنف کے ذریعے سے ممکن نہیں سوائے ناول کے۔‘‘(3)

اب مصنفہ ڈاکٹر نسترن احسن فتیحی کے ناول لفٹ کا جائزہ لیتے ہیں۔

موضوع:

ناول کا بنیاد انسان کی حقیقی زندگی ہے اور اسی لیے داستان کی جگہ ناول نے لیا۔ کیوں کہ داستان کی فرضی دنیا کے

بجائے اس میں حقیقت کو پیش کیا جاتا ہے۔معاشرے کے مسائل کو دیکھ کر تخلیق کار اسے اپنے ناولوں میں حقیقی کرداروں اوراس کے اعمال کے ذریعے پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔اس میں مصنف کا فلسفۂ حیات بھی نظر آتا ہے کسی بھی ناول میں مصنف اسے پیش کر ہی دیتا ہے کیوں کہ مصنف بھی اسی حقیقی دنیا کا رہنے والا ہےاوروہ بھی چاہتا ہے کہ وہ جو سوچتا ہے اسے وہ قاری کے سامنے پیش کرے۔اس ضمن میں ڈاکٹر محمد احسن فاروقی اور ڈاکٹر سید نورالحسن ہاشمی یوں رقم طراز ہیں:

> ''فلسفۂ حیات کی بھی ناول میں کافی اہمیت ہے اس سے یہ مطلب نہیں کہ ناول نگار کو کوئی فلسفہ یا اخلاقی سبق اپنی ناول کے ذریعہ سے ظاہر کرنا ضروری ہے مگر چونکہ ناول نگار کا مطمح نظر زندگی کو پیش کرنا ہے لہذا یہ ممکن ہی نہیں کہ اس کی تصویر زندگی اس کے عام اخلاقی وفلسفی ومذہبی وغیرہ خیالات کی حامل نہ ہو۔ یہ ممکن ہے کہ ناول کے قصہ میں کوئی خاص نظریہ مضمر نہ ہو مگر پھر بھی ناول نگار زندگی کو اپنے نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے بعض چیزوں کو پسند اور بعض کو ناپسند کرتا ہے اس لئے اس کی ناول میں فلسفۂ حیات کی بابت کچھ نہ کچھ اشارے ضرور ملتے ہیں۔ ہر ناول ایک فلسئہ حیات کا عکس پیش کرتا ہے خواہ وہ عکس کتنا دھندلا کیوں نہ ہو۔''(4)

نسترن احسن فتیحی نے ناول کا عنوان لفٹ ایک اشارے کے طوراستعمال کیا ہے۔لفٹ ایک ذریعہ ہے زندگی میں آگے بڑھنے کا جس طرح کسی اونچی عمارت کے آخری منزل تک بغیر کسی محنت کے اورکم وقت میں پہنچنے کے لیے لفٹ کی مدد لی جاتی ہے۔اسی طرح انسان کو بھی اپنی ذاتی زندگی میں آگے بڑھنے کے لیے لفٹ کی ضرورت پڑتی ہے۔اب وہ سڑک ہو یا اس کا دفتر۔لفٹ ایک ایسا مضبوط ذریعہ ہے جس کے سہارے انسان بغیر محنت اور کم وقت میں آسانی سے منزل مقصود تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔اس مشینی دور میں ایک طرف ہر کام کو آسانی سے مکمل کرنے اور حاصل کرنے کی چاہت نے انسانوں کو انسانیت کی بنیادی محرک سے بہت بالاتر کر دیا ہے۔ٹھیک اسی طرح انسان کے ضمیر پر بھی ان چیزوں نے کہیں نہ کہیں اپنے نقوش واثرات ڈالے ہیں۔ بہرحال یہ حقیقی امر ہے کہ کوئی بھی نام اپنے اندر تائثر اور رکھتا ہے اسی طرح لفٹ بھی اسے پورا کرتا ہے۔ناول لفٹ کے''ابتدائیہ''میں مصنفہ

نسترن احسن فتیحی یوں رقم طراز ہیں:

''مجھے اس ناول کو لکھ کر کوئی خاص خوشی نہیں ہوئی۔ کیونکہ ایک قد آور شخصیت کی شکست دراصل انسانی تمدن کی شکست ہے لیکن اجے ورما کے سامنے کوئی اور راستہ نہیں تھا اجے ورما اور ایک عام انسان میں یہی تو فرق ہے کہ عام انسان کمپرومائیز کر لیتا ہے۔ اجے ورما کوئی دیوتا یا پیغمبر نہیں، لیکن اس نے کمپرومائیز نہیں کیا۔۔۔ جو اس کی شکست کا سبب ہے۔ لیکن یہ شکست اور فتح کیا ہے یہ فیصلہ آپ کینگے۔ یہ کہانی کسی فرد واحد کی کہانی نہیں ہے، یہ کہانی تو وقت کی ہے اور اس کا مرکزی کردار بھی وقت ہے۔ شاید وقت سے زیادہ کوئی اہم نہیں۔''(5)

ادب کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اسے سیاست سے آگے چلنا چاہیے۔ اسی تناظر میں لفٹ وہ ناول ہے جس میں قاری کو تعلیمی اداروں سے ہوتے ہوئے ملک کی سیاسی صورت حال کے واضح اشارے ملتے ہیں۔ ناول کے اشاعت کے پندرہ سال بعد بھی دیکھیں تو ناول میں مزکور کرداروں جیسے شدت پسند اور متعصب سوچ رکھنے والے بڑے عہدوں اور اونچی مسندوں پر بیٹھے نظر آتے ہیں۔ آزادی کے بعد محنتی قابل اور اصل حقدار لوگوں کو آگے لانے کی بجائے پچھارنے کا عمل رجعت پسندی ہے۔ جس نے پورے سماج کی ترقی پسند سوچ کو الٹ مفہوم میں مبتلا کر دیا ہے۔ ترقی پسندی کو ذاتی ترقی سمجھ لیا گیا ہے اور رجعت پسند عناصر کو بڑھاوا دیا گیا ہے۔ اس ضمن میں ناول کا یہ اقتباس دیکھیں:

''"حیرت ہوتی ہے صاحب جولڑ کا کل تک اسٹوڈنٹ یونین سے باہر رہ کر بھی ان کی طاقت تھا آج وہ یونین فرنٹ کی فاؤنڈیشن صرف اس لئے مضبوط نہیں ہونے دیتا کہ اس کی پارٹی کا دیوالہ نکل جائے گا۔ اور یہ پیسے کھا کھا کر ان کی جڑیں کاٹتا ہے۔" چوبڑا صاحب نے بات پوری کی۔

"یہی اب کل ہمارے دیش کے نیتا بنیں گے۔ سانسد کی بیٹی سے شادی کا یہی مقصد ہوگا۔" ملک صاحب بولے۔''(6)

مذکورہ بالا اقتباس میں مصنفہ نے اس موضوع کی طرف قاری کو لے جانے کی کوشش کی ہے کہ انسان وقت کے ساتھ بدل جاتا ہے جو کبھی لوگوں کی فلاح کے لیے کام کرتا تھا وہ اب اپنے مفاد کے لیے اس کے خلاف ہی کھڑا

ہونے لگا ہے۔انسان خود کو آسانی سے بڑا بنانے کے لیے اپنے ضمیر سے بھی سمجھوتا کر لیتا ہے۔جس طرح پاٹھک اپنا سیاسی قد بڑھانے اور آگے چل کر نیتا بننے کے لیے وہ سانسد کی بیٹی سے شادی کرتا ہے۔

ہندستان جیسے جمہوری ملک میں ہر طبقے کو یکساں حقوق دیے جانے کی جہد میں جو قدم اٹھائے گیے اس کا غلط استعمال، رسوخ کے ذریعہ ترقی کروانا، ریزرویشن کے بل بوتے اعلیٰ مقام پر تقرری ان سب چیزوں کے جو برے نتائج ہو رہے ہیں اس کی جانب ناول میں نسترن احسن نے واضح اشارے کئے ہیں۔کس طرح سے لائق اور محنتی نوجوان بے روزگار رہ جاتے ہیں اور تنگ آ کر اعلیٰ تعلیم سے توبہ کر لیتے ہیں۔کس طرح خواندہ اور ناخواندہ عورتوں کے حقوق کی پامالی ہمارے سماج میں عام بات ہے۔ان تمام نکات پر ناول لفٹ میں روشنی ڈالی گئی ہے مگر اس انداز میں کہ بس یوں ہی کسی بات کسی تذکرہ کسی واقعہ میں گزر گیا ہو۔مگر پھر بھی یہ اپنا اثر چھوڑنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔دراصل ناول نگار نے قاری کو اپنے مشاہدات و تجربات میں اس طرح ساتھ کر لیا ہے کہ دوران مطالعہ قاری یہ محسوس ہی نہیں کر پاتا کہ پیش نظر واقعات و حادثات سے اس کی شناسائی نہیں ہے۔

ناول میں مصنفہ نے عورتوں کے مسائل، معاشرے میں ان کی حیثیت و درجات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ ناول کا نسوانی کردار میتا کی زندگی کے مسائل قاری کو یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ کیا ہمارے معاشرے میں آج بھی عورتوں کو آزادی حاصل ہے؟ کیا انھیں ان کی مرضی اور خوشی سے اپنی زندگی کے فیصلے لینے کے اختیارات ہیں؟ میتا کی زندگی میں درپیش آنے والے مسائل اور اس کی سنجیدگی کو بیان کرتا ہوا ایک اقتباس ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے:

> ''مگر وہ کیوں سب کی خوشی کی خاطر زندگی بھر کے لیے ایک ایسی راہگزر پر قدم رکھ لے جس کے لیے اس کا دل راغب نہیں ہوتا....وہ ماں، بھابھی، دیدی جیسی زندگی گزارنے کی قائل نہیں...بلکہ شاید بچپن سے انھیں دیکھ کر ہی اس طرز زندگی سے اس کا دل متنفر ہو چکا ہے۔اسے کبھی یہ نہیں لگا کہ اسے شادی شدہ زندگی پسند نہیں...اسے نفرت ہے، تو جبر سے، تھوپے گئے فیصلوں سے...یا اس کی شخصیت کو بالکل نکار دینے سے...اور آج کل گھر والے اس کے ساتھ یہی کر رہے تھے کیونکہ وہ ایک عورت تھی....مگر وہ یوں زور زبردستی سے جھکنے والی نہیں تھی۔وہ اپنی بات صرف اس لیے منوانا چاہتی تھی کہ وہ غلط نہیں تھی۔''(7)

اس ملک میں رشوت اتنا عام ہوگئی ہے کہ ہم اپنے آس پاس قائم شدہ اداروں کے نظام میں پھیلی ہوئی رشوت کو بہ آسانی دیکھ سکتے ہیں۔ یہاں تک کہ انسان کے روزمرّے کی زندگی میں کام آنے والی اشیاء جیسے کھانے پینے کی چیزوں میں بھی نقلی سامان کی خرید وفروخت سے سسٹم میں پھیلے ملاوٹ، کالا بازاری اور کرپشن کا آسانی سے اندازہ ہوجاتا ہے۔ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ رشوت دے کر اپنا سامان بیچنے والا انسان اپنے سامان کی قیمت بڑھا کر رکھتا ہے اور من موافق پیسے وصول کرتا ہے۔ اس سسٹم نے ایک عام انسان کو بھی رشوت خور بنا دیا ہے۔ ایسا کرنا اس کے لیے لازمی ہے کیوں کہ اگر وہ قیمت بڑھا کر نہیں لے گا تو رشوت کہاں سے دے گا۔ اس طرح ملک کی بربادی کا آغاز ہوجاتا ہے۔ اگر ہم اس کے خلاف قدم نہیں اٹھائیں گے تو آہستہ آہستہ یہ اس ملک کے نظام کو کھوکھلا کردے گا۔ رشوت خوری کے خلاف اصول پسند انسان بھی بہت مشکل سے لڑ پاتا ہے۔

ایک اصول پسند انسان کا اپنے اصولوں پر چلنا کافی مشکل کام ہے۔ اسے قدم قدم پر پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کبھی کبھی اپنے اصولوں پر چلنے کی وجہ سے سماج میں اسے تنہا ہی رہنا پڑتا ہے۔ وہ خود کو تنہا پاتا ہے نہ چاہتے ہوئے بھی وہ سماج کو اپنا دشمن بنالیتا ہے۔ اسے اپنے خویش واقارب سے بھی دشمنی مول لینی پڑتی ہے کیوں کہ اپنے اصولوں پر سماج کو چلانا اور ان کے برے اصولوں کو رد کرنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ کبھی کبھی ایسی صورت حال کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے جس میں یا تو اپنے اصول پر قائم رہنا پڑتا ہے یا پھر سماج کی قبول شدہ چیزوں کو ماننا پڑتا ہے مگر ایک غیور اور باکردار انسان کے لیے انسانیت سے بڑھ کر کوئی بھی چیز نہیں ہوتی۔ وہ حق کو پانے کے لیے باطل کو مٹانے کے لیے اپنی جان کو بھی قربان کرنے کے لیے ہر وقت، ہر گھڑی تیار رہتا ہے۔ اس ناول میں بھی ایک اصول پسند انسان کی صورت حال کو بیان کیا گیا ہے جسے مندرزیل اقتباس میں پیش کیا جارہا ہے:

> ''انھیں معلوم تھا کہ یہ اوبجکشن یا اعتراض بڑا بابو کے ساتھ ساتھ دوسرے لوگوں کو بھی ان کا دشمن بنادے گا۔ مگر انھیں ایک چیز تو قربان کرنی ہی تھی۔ "دوستی" یا "اصول۔"''(8)

جس طرح کسی اچھے ناول کا پلاٹ ایک دوسرے سے مربوط ہوتا ہے اسی طرح ہماری زندگی میں بھی ایسے مسائل آتے ہیں جن کا تعلق کسی نہ کسی اور مسئلے سے ہوتا ہے۔ ان مسئلوں کو دیکھ کر ہمیں لگتا ہے کہ اس کا حل بہت

آسانی سے نکالا جا سکتا ہے لیکن جب ہم اس کے تہہ میں جاتے ہیں تو ہمیں معلوم پڑتا ہے کہ اس مسئلے کا حل اتنا آسان نہیں ہے جتنا ہم سمجھتے ہیں۔ساتھ ہی ساتھ ہمیں یہ دیکھنے کو ملتا ہے کہ اس مسئلے کا سبب کئی اور دوسرے مسائل ہیں جن کو حل کیے بغیر اس مسئلے کا کوئی حل نہیں ہوسکتا۔اس طرح کے مسائل ہمارے سماج میں زیادہ دیکھنے کو ملتے ہیں۔سماج کے لوگ جو ایسی صلاحیت رکھتے ہیں کہ ان مسئلوں کا حل نکال سکتے ہیں تو ایسے لوگوں کو ایک دوسرے کا ساتھ دے کر اس مسئلے کو ختم کرنے یا پھر اسے کم کرنے کے لیے مل جل کر کوشش کرنے کی ضرورت ہے۔ایسے مسئلے کا ذکر ناول میں کیا گیا ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو:

> ’’میں نے یہ کتاب شروع کی تھی تو میرے ذہن میں صرف ایک نکتہ واضح تھا اور وہ تھا ہمارے ملک کی ناخواندگی کی شرح اور اس کے اسباب۔مگر جیسے جیسے مسائل کی تہہ میں اترتا گیا میری حیرانی فزوں ہوئی اور میری تحقیق کا دائرہ بڑھتا گیا۔میری اس تحقیق میں میرے ریسرچ اسکالر جاوید عباسی اور مس میتا بوس نے میری بہت مدد کی ہے۔اب لگتا ہے ان کی مدد کے بغیر یہ کام تنہا میرے لیے بہت مشکل بن جاتا.....بہر کیف تو میں آپ کو بتا رہا تھا کہ ایک مسئلے کی جڑ تک پہنچ کر ہمیں لگتا ہے کہ وہیں سے ایک دوسرے مسئلے کی شروعات ہو جاتی ہے۔‘‘(9)

تعلیمی ادارے وہ جگہ ہیں جہاں نسلوں کو سنوارنے اور ان کا مستقبل بنانے کا فریضہ انجام دیا جاتا ہے۔ناول کے مرکزی کردار اجے ورما کے علاوہ دو طالب علم میتا اور پاٹھک کے کردار بھی بہت اہمیت کے حامل ہیں۔میتا ایک محنتی اور ذہین لڑکی ہے جو تعلیم کے ذریعے اپنا مستقبل خود بنانا چاہتی ہے۔میتا تانثیت کی عمدہ مثال ہے جو محض ایک خاموش کردار نہیں بلکہ متحرک اور ہر مقام پر مسلسل کوشش اور جدوجہد کرتی نظر آتی ہے۔پاٹھک جو ابتدا میں ایک مخلص اور محنتی طالب علم کارکن تھا وہ کچھ ہی عرصے بعد سیاسی عناصر کا آلہ کار بن جاتا ہے اور میتا کو بھی پریشان کرتا ہے۔آخر کار میتا جیسے بہترین دماغ اپنے گھر، معاشرے اور حصول روزگار کے دباؤ کا شکار ہو جاتی ہے اور ناانصافیوں سے اکتا کر بیرونی ممالک کی راہ لیتی ہے۔اس ناول کی تانیثی کردار میتا ہر مشکلوں کا سامنا ڈٹ کر کرتی ہے لیکن ایک مقام پر تنگ آ کر ہار جاتی ہے اور اپنا راستہ بدلتے ہوئے ملک چھوڑنے کا فیصلہ کر لیتی ہے۔میتا جیسے کردار دراصل وہ لوگ ہیں جنھیں حقیقی معنوں میں آگے بڑھ کر سماج اور سیاست میں نمائندگی کرنی تھی لیکن یہ نمائندگی پاٹھک

جیسے لالچی لوگوں کو تھمادی جاتی ہے۔

کسی نے سچ ہی کہا ہے اگر آپ کسی ملک کو برباد کرنا چاہتے ہیں تو اس ملک کے تعلیمی نظام کو کمزور کردیں ملک اپنے آپ برباد ہوجائے گا۔اس بات پر جب ہم غور کرتے ہیں تو یہ پاتے ہیں کہ کسی ملک کو ترقی یا پستی کی طرف اگر کوئی لے کر جاتا ہے تو وہ اس ملک کا نوجوان ہے۔اور کسی بھی ملک کا نوجوان خود کفیل تبھی ہوگا جب اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت دوبالا ہوگی۔

اپنے آس پاس دیکھتے ہیں تو ہم پاتے ہیں کہ ہمارے ملک میں بنیادی تعلیم فراہم کرانے کے لیے اسکول تو ہیں لیکن ان میں بنیادی سہولتوں کا اس قدر فقدان ہے جس کی وجہ سے تعلیمی نظام میں بہت ساری خرابیاں پیدا ہوجاتی ہیں۔مہاتما گاندھی جی نے جس بنیادی تعلیم کی وکالت کی تھی وہ تو اب سیرے سے ناپید ہے۔نصاب کی بات کریں تو بابا آدم کے زمانے سے چلا آرہا ہے اس میں وقت کے ساتھ تبدیلی نہیں کی گئی۔حالت یہ ہے کہ جیسے تیسے اسکول سے نکل کر کالج تک پہونچو تو وہاں بھی کسی اور طرح کا نظام حاوی ہوتا ہے۔ ہر چیز مل جاتی ہے لیکن نہیں ملتی ہے تو بس تعلیم۔ اس لیے یہ بھی کہنا غلط نہیں ہوگا کہ جیسی یونی ورسٹی ویسا ماحول۔ویسے ہی نصاب اور نصاب جیسا طالب علم۔

ہمارے ملک میں اسکول اور درس گاہ تو کافی ہیں۔ان میں سرکاری اسکول اچھے خاصے تعداد میں ہیں ان کے علاوہ آئے دن نجی اسکول کثیر تعداد میں کھل رہے ہیں لیکن جب معیاری تعلیم کی بات آتی ہے تو ان اسکولوں میں تعلیم کا فقدان نظر آتا ہے پھر کیا ہے ہم لکیر کا فکیر بن کر صرف اور صرف رٹنا سیکھ جاتے ہیں۔سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت ختم ہوجاتی ہے۔جب تک ہمارے سوچنے اور سمجھنے کی قوت میں اضافہ نہیں ہوگا ہمارے حالات نہیں سدھر سکتے۔اس لیے ہمارے تعلیمی نظام میں بدلاؤ کی ضرورت ہے۔اسی ضمن میں ناول کا ایک اقتباس پیش خدمت ہے:

> ”یقیناً ہماری رتعلیمی اور اقتصادی پسماندگی کا بہت گہرا تعلق آپس میں ہے۔
> غلط اور ناقص تعلیم ساری قوم کا مسئلہ ہے....قوم اس وقت جس بحران سے گزر رہی
> ہے اس کی بہت بڑی وجہ ہے کہ قوم نے اپنے تعلیمی نظام کی طرف توجہ نہیں دی۔
> اس لیے میں نے خصوصاً تعلیمی نظام کے قومی پہلوؤں کی طرف توجہ مبذول کرائی
> ہے تا کہ ہماری تعلیمی پسماندگی دور ہوسکے۔لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ قوم
> کے پسماندہ طبقات کی حمایت کی جائے تا کہ سب کو برابر مواقع مل سکیں۔“(10)

یونی ورسٹی کیمپس اور دلت سیاست کے پس منظر میں لکھا یہ ناول اس طرف ہماری توجہ دلانا چاہتا ہے کہ تعلیمی ادارے وہ نرسریاں ہیں جہاں قوم کا مستقبل تیار ہوتا ہے۔استاد قوم کا معمار ہوتا ہے۔اگر تعلیمی اداروں میں مکروہ سیاست اور جرائم پیشہ عناصر اپنی پکڑ مضبوط کرنے لگیں تو پھر ملک کے اعلیٰ عہدوں پر کرپشن ،اقرباء پروری اور گھٹیا سیاست کو پنپنے سے نہیں روکا جا سکتا۔

برصغیر کی آزادی اور تقسیم کے پس منظر میں اقلیتوں پر پڑتے دباؤ کو بھی عمدگی سے متن کا حصہ بنایا گیا ہے۔ جہاں نصف صدی سے زائد وقت گزر جانے کے بعد بھی اقلیتوں کو تعصب پرستی اور چبھتے سوالوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔آئے دن کی فرقہ پرستی اور نسلی تعصبات قوم کو تنزلی کی جانب لے جاتے ہیں جس کے نتیجے میں ایک قوم صدیوں تک بدحالی اور پستی کا شکار رہتی ہے۔ذات پات سسٹم کے ساتھ ساتھ مذہبی عقائد کو بنیاد بنا کر ان پر کیے جانے والے ظلم و جبر سے ان کو حاشیے پر دھکیلنا نہایت آسان ہے۔مرکز میں اپنی حکومت بنائے رکھنے اور اپنی طاقت کا سکہ چلانے کے لیے جو سیاسی جوڑ توڑ کیا جاتا ہے اس کے غلط نتائج نچلی سطح تک دیکھنے کو ملتے ہیں۔

ہندستان میں صدیوں سے ذات پات کا نظام اور طبقاتی کشمکش موجود ہے۔اس ملک میں کچھ ایسے ذات ہیں جس کے لوگ ہر طرح سے بہت ہی زیادہ پچھڑے ہیں اسے دوسرے لوگوں کے ساتھ لے کر چلنے کے لیے اسے الگ سے موقع فراہم کیا جاتا ہے مگر اس کا فائدہ بھی اسی ذات کے کچھ متوسط تبقے کے لوگ لے پاتے ہیں۔ذات پات کے نظام میں انسان کی صلاحیت کے بجائے اس کی ذات کو بنیاد بنا کر اسے ذمہ داریاں سونپی جاتی ہے جو کہ بجائے خود ایک رجعت پزیر عمل ہے۔کیوں کہ انسان کی صلاحیت اس کی ذہانت، قابلیت اور ایمان داری اس کی بلڈ لائن سے کبھی مشروط نہیں ہوتی۔

ناول لفٹ میں نسترن احسن فتیحی نے کرپشن اور رزرویشن کو موضوع بنایا ہے۔اس ناول میں یونی ورسٹی جیسے مہذب معیاری اور اعلیٰ تعلیمی ادارے میں پھیلی بدعنوانی کو علامتی انداز میں بیان کیا ہے۔مصنفہ نے اپنے عہد کے انتشار، سماجی برائیوں، زیادتیوں اور کج رویوں پر بھی نشانہ لگایا ہے لیکن اس خوبی کے ساتھ کہ اس پر مقصدیت حاوی نہیں ہوا۔

ہمارے اطراف میں ایسے بھی لوگ ہیں جو بہت چالاک اور عیار قسم کے ہیں۔وہ ہمیں دکھاوے کی عزت اور

محبت سے بیوقوف بناتے ہیں۔ان کا اصل مقصد اپنا کام نکالنا ہوتا ہے۔وہ اپنے کام کو کرانے کے لیے آپ سے ایسے گھل مل جاتے ہیں اور اس قدر آپ کی خدمت میں حاضر رہتے ہیں کہ آپ اس کے ارادے کو نہیں جان پاتے کہ آخر اس کا اردہ کیا ہے۔پہلے وہ ہمیں اپنی خدمت سے متاثر کرتے ہیں اور بعد میں ہمارے دل میں ایک خاص جگہ بنا لیتے ہیں۔وہ یہ جانتے ہیں کہ ایک بار دل میں جگہ بنالی تو وہ اپنا مطلب آسانی سے نکال پائیں گے۔وہ دل میں جگہ بنانے کے لیے کچھ بھی کر گزرنے کو تیار رہتے ہیں۔ایسے لوگ صرف آپ کے ساتھ اس طرح کا سلوک نہیں کرتے ہیں۔وہ ہر کسی کے ساتھ اچھے سے پیش آتے ہیں تا کہ ان پر کسی کو کسی طرح کا شک وشبہ نہ ہو مگر وہ آپ پر کچھ خاص دھیان رکھتے ہیں تا کہ وہ آپ کا اعتبار حاصل کر سکیں۔ایسے لوگ مطلب پرست ہوتے ہیں اور اپنا کام کرانے کے لیے کسی بھی حد تک گر سکتے ہیں، یہاں تک کہ وہ اپنی جان کی بھی پرواہ نہیں کرتے۔ان کا صرف ایک ہی مقصد ہوتا ہے کہ وہ اپنا غرض حاصل کرنے کے لیے اپنی جان کی بازی تک لگا کر مطلب حاصل کرنے میں پیچھے نہیں رہتے۔وہ موقع کی تلاش میں کوشاں اور سرزد رہتے ہیں۔اسی طرح کے عیاری سے اپنا کام کرانے اور ترقی کرنے والے جو اپنی جان تک کی بازی لگا دیتے ہیں کے بارے میں نسترن فتیحی کے ناول میں ذکر آیا ہے جسے مندرجہ ذیل اقتباس میں پیش کیا جا رہا ہے:

> ’’"جی سر...مگر آپ نے یہ نہیں پوچھا کہ جسے چوٹ لگی تھی وہ آدمی کون تھا...."
>
> " کون تھا...؟"
>
> "اپنا نیک رام سر.....اصل تو یہی خبر اہم ہے۔"
>
> میں نے کہا تھا نا آج کل ان کی سیوا میں رہتا ہے ہر وقت آج اپنی اس سیوا سے انھیں تو بس خرید لیا اس نے۔"
>
> "عجیب آدمی ہے۔"اجے کو واقعی حیرت ہوئی۔
>
> "عجیب آدمی نہیں سر....تیز آدمی ....یہ کبھی کسی سے کچھ نہیں مانگتا ہے۔بس دیتا رہتا ہے جو کچھ دے سکتا ہے۔اب ظاہر ہے اپنے سے بڑوں کو اپنی سیوا ہی دے سکتا ہے اور اس کے بدلے میں اسے وہ مل جاتا ہے جو اس کی کلپنا (تصور) ہوتی ہے۔"‘‘(11)

اس ملک کو آزادی ملے ستر سال سے زیادہ ہو گیا مگر آج بھی ہمارے ملک کے لوگ اپنی وہی پرانی سوچ کے غلام ہیں۔ ہمارے ملک میں آج بھی وہی پرانی سوچ پائی جاتی ہے جو آزادی سے پہلے پائی جاتی تھی۔ اس سوچ میں تبدیلی آئی بھی ہے تو جگہ جگہ اس میں رکاوٹیں بننے کی کوشش کی گئی ہے۔ آج بھی ہمارے ملک میں عورتوں کو وہ درجہ نہیں دیا جاتا جس کی وہ مستحق ہیں۔ ان کی حق تلفی کی جاتی ہے اور اس کام کو مرد اپنی شان سمجھتا ہے۔ عورت کے پاس قابلیت، جزبہ، ہنر اور قوت سب کچھ ہونے کے باوجود بھی آج اس کام کو نہیں کرسکتی جو وہ چاہتی ہے، کیوں کہ اس کی خواہشات کا کوئی مول نہیں اس کے اوپر مرد اپنا حق سمجھتا ہے، اسے صرف اپنی ضرورت پوری کرنے کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کی عورت ہمیشہ اس کے پیچھے چلے کبھی اس کے ساتھ ساتھ نہ چلے۔ حالاں کہ عورت کو صرف مرد کے ساتھ ساتھ چلنے ہی نہیں اس سے آگے نکلنے کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا کے ایک مرد کو ہے۔ ایسے ہی ایک مرد کی سوچ کو بیان کرتا ہوا اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ''ہم لڑکیوں کو صرف ٹائم پاس کے لیے پڑھنے دیا جاتا ہے۔ پڑھ لیا اگر بیچ میں ہی شادی کی عمر اور بات ہوگئی تو بس کر لو شادی اس سے زیادہ آگے ہمارے لیے کچھ نہیں۔''(12)

اس ملک میں نوکریاں محنت اور قابلیت کے بدولت ملتی تو ہیں مگر اس کے لیے کتنا وقت لگے اور اسے نوکری مل جائے اس کی کوئی گارنٹی نہیں۔ کیوں کہ آج کل نوکریاں اسی کو بہ آسانی ملتی ہے جس کے پاس کسی بڑے عہدے والے کا سفارش ہو یا پھر اس کے پاس رشوت دینے کے لیے پیسے ہوں۔ اسی طرح اس ملک کے اعلیٰ سرکاری تعلیمی اداروں میں داخلہ لینے کے لیے بھی سفارش اور رشوت کا بول بالا ہے۔ اس نوکری اور ایڈمیشن کے نام پر لوگوں سے اچھی رقم وصول کر لیتے ہیں۔ اگر کسی وجہ سے اسے نوکری یا ایڈمیشن دلانے میں ناکام ہو گئے تو اس کو روپیے بھی واپس نہیں کرتے۔ اس طرح سے نوکری پانے والوں کی کمی بھی نہیں ہے اس لیے ایسے لوگوں کو جھانسے میں آسانی سے لے لیا جاتا ہے۔ مصنفہ نے اس موضوع کو بھی اپنے ناول میں جگہ دی ہے جسے مندرجہ ذیل اقتباس میں دیکھا جا سکتا ہے:

> ''اجے کو آج اس خبر پر یقین ہو گیا تھا کہ اس یونیورسٹی کے اندر کچھ لوگ ایڈمیشن اور اپائنٹمنٹ کے نام پر بڑے گھناؤنے کھیل کھیل رہے ہیں اور کچھ معصوم لوگوں کو جھوٹے سبز باغ دکھا کر ان کی استعداد کے لحاظ سے ان کی جیب

ہلکی کروا لیتے ہیں۔ جو جتنا دے سکنے کا اہل ہوتا ہے اس سے اتنی موٹی رقم وصول کر لی جاتی ہے۔کبھی کبھی اگر اس گروہ کے لوگوں کی چال صحیح پڑ جاتی ہے تو ان کے وارے نیارے ہو جاتے ہیں۔مگر یقیناً ایسے لوگوں کو تنہا قصوروار نہیں کہا جا سکتا۔ان کے ساتھ ساتھ وہ لوگ بھی اتنے ہی قصوروار ہیں جو ان کے جھانسے میں آجاتے ہیں اور ہر وقت بے وقوف بننے کے لیے تیار بیٹھے رہتے ہیں۔جنھیں سیدھے اور سچے راستے پر اعتماد نہیں ہوتا....ایسے لوگوں کو کون بچا سکتا ہے جو خود ڈوبنے کے لیے تیار بیٹھے ہوں۔''(13)

ہندستان کو انگریزوں کی حکومت سے آزاد ہوئے آج ستر سال سے زیادہ کا وقت ہو گیا ہے۔ملک جب آزاد ہوا تھا تو ہندستان کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔محمد علی جنّا مسلمانوں کے لیے ایک الگ ملک چاہتے تھے۔انگریز بھی یہی چاہتے تھے کہ اس ملک کو دو حصوں میں تقسیم کر دیں تا کہ دونوں آپس میں لڑتے رہیں اس طرح ایک حصہ ہندستان تو دوسرا پاکستان بنا۔آزادی کے وقت دونوں طرف سے لوگوں ہجرت کی۔کچھ مسلمان اپنی مرضی سے ہندستان میں ہی رہے کیوں کہ انھیں اس ملک سے پیار تھا۔ہجرت کے وقت بہت خون ریزی ہوئی۔ ہندو اور مسلمان دونوں آپس میں لڑنے لگے تھے۔اس کے بعد بابری مسجد کا مسئلہ بھی آیا جسے 1992 میں توڑ دیا گیا اور پھر سے ہندو مسلم اتحاد میں تفرقہ آیا اور قتل عام ہوا۔2002 میں گجرات کے گودھرا میں ہندو مسلم فسادات ہوئے اور بہت سارے مسلم اور کچھ ہندو مارے گئے۔آج بھی جگہ جگہ فسادات کے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔رام مندر کے مسئلے کا حل کرنے کا وعدہ کر سرکار بنانے والی پارٹی نے بھی اس کا کوئی حل نہیں نکالا اور مستقبل میں بھی اس کے حل کی گنجائش کم ہی ہے۔کیوں کہ اگر اس نے اس کا حل نکال دیا تو پھر نام نہاد ہندو پارٹی کے پاس کوئی مدع نہیں بچے گا۔حالانکہ رام مندر کے نام پر 2014 اور 2019 میں بھی بی جے پی کی سرکار مکمل اکثریت میں آئی لیکن سرکار بننے کے پانچ سال گزرنے کے بعد بھی رام مندر کو نہیں بنایا گیا۔آج سے ڈیڑھ دہائی قبل 2003 میں شائع ہوئے ناول لفٹ میں یہ اشارہ کیا گیا تھا۔مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''ارے صاحب یہ اس ملک میں اب تک ایڈجسٹ نہیں کر پائے آپ گھر کی بات کر رہے ہیں۔" چوپڑا صاحب نے اپنی طرف سے مذاق کیا تھا یا ان کے

دل کی آواز تھی مگر اشوک اور اجے ورما نے چونک کر انھیں دیکھا....ملک صاحب
کے چہرے پر بھی ایک رنگ آکر گزر گیا۔ بہت ضبط کے ساتھ انہوں نے کہا...
" آپ جو کچھ بھی کہیں لیکن میرے تئیں یہ ملک جتنا آپ کا ہے اتنا میرا
ہے... یہ الگ بات ہے کہ روز بروز یہ احساس قوی ہوتا جارہا ہے کہ چند لوگ اس
ملک کے مسلمانوں کے ساتھ بہت سوتیلا سلوک کررہے ہیں۔اب آپ لوگ ہی
بتا سکتے ہیں کہ ایسا کیوں ہے؟"‘‘(14)

مکالمہ نگاری:

ناول لفٹ ہندستان کی یونی ورسٹی کا ایک زندہ جاوید تصویر ہے۔اس موضوع پر اتنی وضاحت وسراحت کے ساتھ اب تک اردو زبان میں بہت کم ناول منظر عام پر آیا ہے۔ناول لفٹ ایک کیمپس ناول ہے۔اس ناول میں یونی ورسٹی کی خاص فضا، ماحول اور مقام کوملحوظ ترتیب رکھا گیا ہے۔مصنفہ نے اپنے تجربات ومشاہدات کو بہت ہی خوبصورتی کے ساتھ ناول کے شکل میں ڈھال دیا ہے۔مصنفہ چوں کہ خود اس ماحول ومعاشرے کی فرد رہی ہیں۔ ان کا واسطہ ایسے ہی ماحول اور افراد سے پڑتا رہا ہے جس کی واضح صورتیں اس ناول کے متن میں موجود ہیں۔ یونی ورسٹی کیمپس، طالب علم، پروفیسرز، اسٹاف، ہر درجے کے کام کرنے والے ان کا مزاج، ان کے افکار آپسی تنازعات اور ذہنی وسیاسی تفریق وغیرہ کوحسن اسلوب کے ساتھ ناول میں پیش کیا ہے۔ساتھ ہی طلباء اور ریسرچ اسکالر کے مزاج ان کے مسائل وغیرہ کو جس خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے وہ ایک یونی ورسٹی استاد یا اس کیمپس سے تعلق رکھنے والا کوئی انسان ہی کر سکتا ہے۔اس معاملے میں اپنے تجربات ومشاہدات کو استعمال کرنسترن احسن فتیحی نے اپنے ناول کے کرداروں کاتخلیق کیا۔مصنفہ نے پھران کرداروں سے ماحول اور کردار کی خوبیوں کا خیال رکھتے ہوئے اس سے مکالمہ ادا کروائے ہیں۔ کیوں کہ مکالمے سے ہی مصنفہ اپنے خیالات کو قاری کے سامنے رکھتی ہیں اور اس طرح ایک خوبصورت ناول اردو ادب کو دیا۔

اچھے ناول کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کا کردار حقیقی دنیا کے کردار جیسا ہو جسے پڑھ کر قاری کے دل میں کسی طرح کا کوئی شک وشبہ نہیں ہو کہ ناول کا کردار کسی بھی طرح حقیقی دنیا کے کردار سے الگ ہے۔اس میں کامیاب

ہونے کے لیے ناول نگار کو اپنے کرداروں کے درمیان ہونے والے مکالموں پر بہت ہی زیادہ دھیان مرکوز کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ایک کامیاب ناول ہونے کے لیے اس کے کرداروں کا کامیاب ہونا بہت ضروری ہے اور ایک کامیاب کردار کے لیے اس کے ذریعہ پیش ہونے والے مکالمے کا اچھا ہونا بھی بے حد ضروری ہے۔ ناول کے مکالمے کے بارے میں ڈاکٹر محمد احسن فاروقی اور ڈاکٹر سید نورالحسن ہاشمی یوں رقم طراز ہیں:

> ''اچھے مکالمہ کے لئے دو شرطیں ضروری ہیں۔ایک یہ کہ وہ ناول کا اہم جزو ہو یعنی پلاٹ کا ارتقا اور کردار کی خصوصیات کا اظہار اسی کے ذریعہ سے کیا جائے۔وہ مکالمہ جو پلاٹ یا کردار سے بے تعلق ہو فضول ہے اور چاہے اس کی لفظی اور معنوی خوبیاں کتنی ہی اہم ہوں،اسے ناول سے بالکل نکال دینا مناسب ہے۔آج کل اشترا کی ناول نگار اپنے مکالموں میں اس قسم کی سوشل بحثیں چھیڑ دیتے ہیں جن کا قصہ وکردار سے کوئی تعلق نہیں ہوتا یہ سخت غلطی ہے۔
>
> دوسرے یہ کہ مکالمہ کو نیچرل صاف اور موزوں ہونا چاہیے ہر کردار کی بات کا رنگ بالکل جدا ہونا چاہیے کیونکہ ہم روز کی زندگی میں دیکھتے ہیں کہ ہر شخص اپنی فطرت کے مطابق بات کرتا ہے اور اپنی بات چیت کا خاص انداز رکھتا ہے۔''(15)

اس ناول کو لکھتے وقت مصنفہ نسترن احسن نے یہ کوشش کی ہے کے کسی کردار سے حسب ضرورت ہی کلام کرایا جائے۔اس میں وہ کامیاب بھی ہوتی ہیں۔ناول کو پڑھتے وقت قاری کو ایسا نہیں لگتا کہ کوئی بات واضح نہیں ہوئی ہے اور اس کی وضاحت کے لیے دیگر کلام کی ضرورت ہے۔اس کے ساتھ یہ بھی نہیں لگتا کہ مکالمہ ضرورت سے زیادہ ہے۔مصنفہ نے اپنے کرداروں کے درمیان ہونے والے مکلامے کو ضرورت سے زیادہ طول نہیں دی ہے اور نا ہی اسے کم کیا ہے۔مندرجہ ذیل اقتباس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے:

> ''"پردیپ میری ڈاک ہے؟"
>
> "لاؤ یہیں دے دو، اور سنو تم نے اجے کو دیکھا ہے؟"
>
> "وہ تو پچھلے دو دنوں سے نہیں آئے۔"
>
> "ہوں....ایسا کرو، اچھا چھوڑو، جاؤ میں خود کچھ کرتا ہوں، ہاں دھیان رکھنا اگر کہیں دکھ جائے تو بھیج دینا۔"

"ٹھیک ہے صاحب"''(16)

اوپر آئے اقتباس سے یہ پتہ چلتا ہے کے کوئی پروفیسر یا افسر حقیقی زندگی میں بھی آفس کے چپراسی سے یا اپنے سے نیچے عہدہ کے ملازم سے زیادہ باتیں نہیں کرتا۔اس سے اتنی ہی باتیں کرتا ہے جتنی کی درکار ہوتی ہے۔

ہمارے اطراف میں جو سرکاری دفاتر ہیں ان میں سے اکثر و بیشتر دفتروں میں ایک سیکشن آفیسر ہوتا ہے۔ ہندستان ایک وسیع ملک ہے اور اس کے زیادہ تر حصوں میں ہندی بولی جاتی ہے اور کچھ حصوں میں صوبائی زبان بولی جاتی ہے۔جن حصوں میں ہندی بولی جاتی ہے وہاں سیکشن آفیسر کو بڑا بابو کے نام سے پکارا جاتا ہے اور یہ بڑا بابو زیادہ تر ہندی میں ہی باتیں کرتا ہے۔ ہندی اس ملک کی قومی اور سرکاری زبان بھی ہے۔سارے سرکاری کام ہندی میں ہی کرنے اور کرانے کے لیے ہندستان کی مرکزی سرکار زور بھی ڈالتی ہے۔ اسی ضمن میں ناول کا یہ اقتباس پیش ہے جس میں بڑا بابو کے ہندی مکالمے کو پیش کیا گیا ہے:

''"آپ نشچنت (مطمئن) رہیں سر....کام آج ہی ہو جائے گا۔ہم تو آپ کی ایسی کرپا درشٹی (نظر کرم) کے منتظر رہتے ہیں۔تو مجھے آ گیا ہے سر۔"انھوں نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔''(17)

اوپر آئے اقتباس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ نسترن فتیحی نے مکالمے کراتے وقت کردار کی خوبیوں اور اس کے ماحول کا بھی پورا پورا خیال رکھا ہے۔اس لیے مصنفہ نے اپنے ناول میں بڑا بابو کے مکالمے میں ہندی الفاظ کا استعمال کیا ہے۔

ہمارے یہاں دودھ والا، سبزی والا اور اس طرح کے دوسرے لوگ جو بازار میں گھوم گھوم کر اپنا سامان بیچتے ہیں وہ زیادہ پڑھے لکھے انسان نہیں ہوتے ہیں۔ایسے لوگوں کا تعلق زیادہ تر دیہات سے ہوتا ہے کیوں کہ دیہات میں رہنے کا خرچ کم ہے۔وہ کام کے لیے شہر آتے ہیں اور پھر شام کو واپس چلے جاتے ہیں۔خاص کر دودھ والا وہ دیہات سے ہی آتا ہے کیوں کہ جانوروں کو رکھنے کی سہولت ہوتی ہے، جانوروں کے لیے غذا کا سامان کم قیمت میں بہ آسانی گاؤں میں ہی مل جاتا ہے۔اس لیے زیادہ تر دودھ والا دیہاتی زبان کا استعمال کرتا ہے۔مصنفہ نے ناول میں دودھ والے کے ماحول کا خیال رکھتے ہوئے اس سے دیہاتی زبان میں ہی مکالمہ پیش کرایا ہے جسے مندرجہ ذیل اقتباس میں دیکھا جاسکتا ہے:

’’"اب کیا بتائیں صاحب ادھر ڈی بلاک میں ایک صاحب رہتے ہیں۔
کچھ مہینے پہلے ہی ان کو ڈیلی ویجز پر کام کرنے والوں کا انچارج بنایا گیا ہے وہی
دیتے ہیں یہ روپے۔"
"ڈیلی ویجز کا انچارج.......؟ اچھا وہ نیک رام؟"
"جی صاحب...وہی...اب یہ نوٹ ہمرے لیے بھی مصیبت ہی ہے صاحب
اسی لیے ابکی ہمنے کہ دیا ہے کہ اگلے مہینے سے نہیں لیں گے ایسا نوٹ سب۔"
‘‘(18)

یہ انسانی فطرت ہے کہ باتیں کرتے وقت وہ کبھی کبھی اپنی زبان کے علاوہ کسی اور زبان کے مشہور محاورے کا استعمال بھی کرتا ہے تا کہ اس کی باتوں کا وزن بڑھ جائے اور وہ اپنی بات کو اچھی طرح سے واضح کر سکے۔ اردو چوں کہ ہندستان میں پیدا ہوئی اور یہیں پھلی پھولی ہے۔ اس کے علاوہ اردو میں عربی اور فارسی کے الفاظ بھی کثرت سے استعمال ہوتے آئے ہیں۔ ان دونوں زبانوں کے علاوہ ہندستان کی دوسری زبانیں ہندی، اودھی، ہریانوی زبان کے ملنے سے ہی اردو پیدا ہوئی ہے۔ اس لیے ان زبانوں کے محاوروں کا استعمال ہونا عام بات ہے۔ اس ناول میں بھی فارسی کا محاورہ استعمال ہوا ہے جسے مندرجہ ذیل اقتباس میں پیش کیا جا رہا ہے:

’’"ہاں تم نہیں مانتیں تو تکلیف ہوتی مگر اب تو تم آ گئی ہو۔ دیکھو آج کو گئے
ہوئے دو ماہ ہو گئے اور تم اب آئی ہو۔ پر دیر آید درست آید۔"‘‘(19)

انگریزوں نے ہندستان کے علاوہ دنیا کے مختلف ممالک میں اپنی حکومت قائم کی تھی چوں کہ انگریزوں کی زبان انگریزی تھی اس طرح یہ دنیا کے زیادہ تر ممالک میں بولی جانے اور سمجھی جانے والی زبان بن گئی۔ اس طرح یہ ایک بین الاقوامی زبان ہو گئی۔ ہندستان میں انگریزی زیادہ تر پڑھے لکھے طبقے والے استعمال کرتے ہیں۔ انگریزی بولنے والے کی بات غور سے سنی جاتی ہے اور اسے عزت کی نگاہ سے بھی دیکھا جاتا ہے۔ ایک پڑھا لکھا انسان نہ چاہتے ہوئے لاشعوری طور پر انگریزی بول ہی دیتا ہے۔ اس ناول میں بھی کئی جگہ پڑھے لکھے لوگوں کے ذریعہ ناول نگار نے انگریزی کے الفاظ استعمال کرائے ہیں جسے مندرجہ ذیل اقتباس میں پیش کیا جا رہا ہے:

’’اسی درمیان چائے آ گئی۔ تو بیتا نے وملا سے کہا.....وملا سے نکال کر ذرا میرا

کمرہ صاف کروادو کسی دن ادھر بہت دنوں سے میں کچھ کر نہیں پائی ہوں اس لیے بہت گندا ہو گیا ہے۔

"جب کہیے دیدی میں چل پڑوں گی۔" وملا نے چائے پکڑاتے ہوئے کہا۔

"جب کیا آج ہی چلی جاؤ..... یہاں کا کام وہاں سے آ کر کر لینا۔" سیما نے کہا۔

" نہیں بھابھی اتنی جلدی بھی نہیں ہے.....کسی دن بھی کروالوں گی۔"

" نہیں اگر تم اپنے گھر جا رہی ہو تو لے جاؤ...... یہاں تو یہ سارا دن کرتی ہی رہتی ہے وہاں سے آ کر کر لے گی۔"

" تھینک یو بھابھی...سو نائس آف یو" میتا نے احسان مندی سے کہا۔' (20)

اجے ورما جب اپنے بیمار والد سے ملنے اپنے گاؤں آتا ہے۔اسی دوران اس کے یونی ورسٹی سے تار آنے پر جب اس کے والد اس سے سوال کرتے ہیں، کیا یہ بلانے کا تار آیا ہے؟ اس صورت حال میں اجے ورما نے اپنے بیمار والد کو جس طرح جواب دیتا ہے اسے مندرجہ ذیل اقتباس میں پیش کیا جا رہا ہے:

'' "سب ٹھیک تو ہے...کیا بلانے کا تار ہے۔" بابا نے اپنی ساری توانائی اکٹھی کر کے سوال کیا۔

" نہیں بابا... سب ٹھیک ہے ۔ ایک گوشٹھی تھی جو ابھی نہیں ہوگی، اسی کا تار ہے۔ میں اپنے ایک ودیارتھی سے کہہ کر آیا تھا کہ سوچنا ملتے ہی تار کر دینا۔" '' (21)

مذکورہ بالا اقتباس سے اس بات کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ مصنفہ نسترن احسن فتیحی نے مکالمے کراتے وقت نہ صرف کردار کا خیال رکھا ہے بلکہ ماحول کا بھی پورا پورا خیال رکھا ہے۔ جب کوئی بیمار ہوتا ہے تو انسان کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ زیادہ باتیں نہ کرے کیوں کہ اس سے اس کے صحت یاب ہونے میں وقت لگ سکتا ہے یا مزید طبیعت خراب ہو سکتی ہے۔اس لیے مصنفہ نے اجے ورما سے کم باتوں میں زیادہ اطمینان بخش جواب دلایا ہے۔ہم سبھی اپنی ذاتی زندگی میں بھی ان باتوں کا پورا خیال رکھتے ہیں۔

ناول میں مصنفہ نے ہر ممکن کوشش کی ہے کہ اس ناول کے ہر کردار سے اس کے ماحول اور اس کی خوبیوں

کے مطابق ہی مکالمہ ادا کروایا جائے۔ مذکورہ بالا اقتباسات سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ مصنفہ نے بہت ہی باریکی سے ناول کے ہر ایک کردار سے ماحول اور حالات پر نظر رکھتے ہوئے مکالمے ادا کرائے ہیں۔ اس کے علاوہ ناول میں مصنفہ نے کہیں کہیں مکالمے میں مزاحیہ انداز بھی رکھا ہے، محاوروں کا بھی استعمال کیا ہے۔

منظر نگاری:

منظر نگاری ناول کا ایک اہم جز ہے۔ جس طرح ایک کامیاب ناول کے لیے اچھا کردار اور اچھا مکالمہ ضروری ہے ٹھیک اسی طرح منظر نگاری بھی ایک اہم جز ہے۔ ناول میں جتنا حقیقی اور حقیقت سے قریب منظر کو پیش کیا جائے گا قاری ناول پڑھتے وقت خود کو اس سے اتنا ہی زیادہ قریب پائے گا۔ کیوں کہ قاری اس وقت خود کو پیش کیے جانے والے منظر میں مرغوب کرتا جاتا ہے۔ اگر منظر حقیقت سے دور ہو تو قاری بھی خود کو ناول سے دور پائے گا۔ اس لیے ناول نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ جس موضوع پر ناول لکھ رہا ہے اس سے جڑے سبھی طرح کے ماحول کو اپنی نظروں میں رکھے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر محمد احسن فاروقی اور ڈاکٹر سید نورالحسن ہاشمی یوں رقمطراز ہیں:

> ''دوسری چیز ماحول ہے یعنی یہ کہ قصہ کس خاص طرز زندگی کس مخصوص زمانہ و ماحول کن مخصوص اخلاق ورسوم سے تعلق رکھتا ہے۔ اکثر ناول نگار کسی جغرافیائی ماحول کو لے کر اپنے ہر ناول میں اسی ماحول کے مختلف پہلوؤں کو پیش کرتے ہیں۔ کوئی کسی خاص شہر کی، کوئی کسی خاص طبقہ کی، کوئی کسی دیہات کی، کوئی محض سیاسی، کوئی اقتصادی وغیرہ زندگی کی عکس کشی کو اپنا دائرہ بنا لیتا ہے، بعض ناول نگار اپنے تمام ملک کو مجموعی حیثیت سے سامنے رکھ کر اس کی مکمل تصویر پیش کرتے ہیں۔ دوسرے قسم کے ناول نگاروں کو اول قسم کے ناول نگاروں پر ترجیح دی جاتی ہے مگر فنی حیثیت سے دونوں میں کوئی فرق نہ ہونا چاہیے۔''(22)

ناول لفٹ اس کے مرکزی کردار اجے ورما کی زندگی کے تیس سالوں کو بیان کرتا ہے۔ اس ناول کا آغاز یونی ورسٹی سے ہوتا ہے اور ناول ختم بھی یونی یورسٹی میں ہی ہوتا ہے۔ اجے ورما ایک ریسرچ اسکالر ہے، وہ طالب علمی کے دور سے نکل کر اپنے ہی یونی ورسٹی میں پروفیسر بنتا ہے۔ ناول کے آخر تک وہ یونی ورسٹی سے ہی جڑا رہتا ہے، تو لازم ہے کہ ناول میں یونی ورسٹی کے ماحول اور اس کے مناظر کو پیش کیا جائے گا۔ چوں کہ مصنفہ خود بھی اسی ماحول

میں اپنی زندگی کے کئی سال گزارے ہیں اور اپنی نظر یونی ورسٹی کی ہر ایک چیز پر رکھتی ہیں، وہ یونی ورسٹی کے ماحول سے بخوبی واقف ہیں۔ نسترن فتیحی اپنے تجربے اور عمیق مشاہدوں کا استعمال کر یونی ورسٹی کے ماحول کو ناول میں پیش کرتی ہیں۔ یونی ورسٹی میں طالب علموں کے لیے ہر طرح کی سہولت فراہم کی جاتی ہیں۔ ان کے لیے ہوسٹل، کتب خانہ، کھیل کا میدان، جم خانہ اور اس کے علاوہ بھی بہت ساری سہولتیں دی جاتی ہیں تا کہ طالب علم صرف اپنی پڑھائی اور مستقبل پر دھیان رکھیں۔ یونی ورسٹی کی عکاسی کرتا ناول کا ایک اقتباس مندرجہ ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اس سے نسترن احسن فتیحی کی منظر نگاری پر دسترس کا اندازہ مل جاتا ہے:

''"یونیورسٹی کی صاف شفاف چوڑی سڑکیں جن پر دو رویہ تناور درخت اپنی شفقت کا سایہ کیے کھڑے تھے۔ مختلف شعبوں کی سر بستہ بلند عمارتیں دعوت عمل دیتی ہوئی اپنی کشش کا جادو سارے ماحول میں گھول رہی تھیں۔ مختلف ہوسٹل کی عمارتوں کے حاشیے پر نمایاں سرخ اور سبز رنگ اسے ٹریفک لائٹ سے مشابہ لگیں۔ آج اس کی نظروں میں جیسے عمارتوں کا یہ رنگ بھی ایک نئے مفہوم کے ساتھ اجاگر ہو رہا تھا۔ جیسے یہاں آنے اور جانے والے اسٹوڈنٹس کے لیے شعوری کوشش کے طور پر انہیں یہ رنگ عطا کیا گیا ہے۔ آج اس کے لیے بھی جیسے سبز رنگ نمایاں ہوتا جا رہا تھا۔ اور وہ آگے اور آگے بڑھنے پر مجبور تھا...''(23)

ہندستان کو آزاد ہوئے ستر سال سے زیادہ ہو گئے ہیں۔ ان ستر سالوں کے وقفہ میں ملک نے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ ہندستان نیوکلیئر بم بنا کر ترقی یافتہ ملکوں کے ساتھ کھڑا ہو گیا ہے۔ سیٹلائٹ میں مہارت حاصل کر دوسرے ممالک کا تیارہ آسمان میں بھیج رہا ہے۔ جب ملک آزاد ہوا تھا تو اس وقت ہندستان ایک ایسے ملک کے نام سے جانا جاتا تھا جہاں صرف کھیتی ہوتی تھی۔ وہ بھی ایسی ہوتی تھی کہ کسی سال فصل اچھی ہوتی اور کسی کسی سال سوکھا پڑ جاتا تو اس سال اناج بھی نہیں ملتی۔ اس ملک میں کارخانے وغیرہ بہت ہی کم تھے۔ اس لیے یہاں کے لوگوں کے پاس کام کرنے کے بھی مواقع نہیں تھے۔ آج بھی ہندستان میں دو طرح کی زندگی ہے ایک شہری زندگی جہاں کے لوگوں نے ترقی کی اور دوسری دیہاتی زندگی جہاں آج بھی بنیادی ضرورت کا سامان نہیں ملتا۔ ان لوگوں کو شہر جا کر سامان لانا پڑتا ہے۔ آج بھی گاؤں کے راستے اور سڑک شہر کے مقابل بہت پیچھے ہے۔ گاؤں اور شہر کے منظر کو

مصنفہ نے اپنے ناول میں دکھایا ہے جسے مندرجہ ذیل اقتباس میں پیش کیا جارہا ہے:

''بستی کے بیچ سے نکلتی ہوئی سڑک جو پہلے بہت کشادہ تھی اب اتنی تنگ ہوگئی تھی کہ وہاں سے گزرتے ہوئے گھٹن کا احساس ہو رہا تھا.... کیونکہ سڑک کے دونوں طرف چھوٹی چھوٹی بے شمار دکانیں بن گئی تھیں...جن میں بچوں اور انسانوں کی بہتات نظر آ رہی تھی۔جن کے چہروں پر وحشت اور بھوک برس رہی تھی، ایسا لگ رہا تھا کہ یہاں کے لوگوں نے ترقی کی خواہش میں یہ دکانیں کھولی ہیں..... جن میں کہیں مکھی بھنکتی ہوئی جلیبیاں اور پاؤ بک رہے تھے....تو کہیں رنگوں کی آمیزش سے ہری لال پیلی مٹھائیاں بنی ہوئی تھیں....جو دور سے ہی پکار پکار کر کہہ رہی تھیں کہ اگر اپنی زندگی سے تنگ آ چکے ہو تو مجھے کھا لو میں تمھیں اس کرب سے نجات دلانے کی طاقت رکھتی ہوں۔

اجے ورما حیران تھے کہ یہ اسی ہندستانی ترقی یافتہ سماج کا حصہ ہے جس نے بڑے جوش وخروش سے آزادی کے پچاسویں سالگرہ منائی تھی۔اور نئی صدی کا بھی اسی جوش وخروش کے ساتھ خیر مقدم کیا..... یہ اسی ہندستانی سماج کا حصہ ہے جس نے نیوکلیئر بم بنانے میں ترقی یافتہ ملکوں سے کندھے سے کندھا ملا لیا ہے۔ جہاں کے ملک کے رہنماؤں کے گھر کی سجاوٹ (Interior Decoration) کے لیے غیر ملکی اکسپرٹ آتے ہیں۔مگر قوم کے رہنماؤں کو یہ کیوں نظر نہیں آتا کہ ملک کے یہ سات آٹھ کروڑ بچے آج بھی تعلیم سے محروم ہیں۔کیا اس نئی صدی سے ان کا کوئی مطالبہ نہیں...... یا اس ملک کو ان کی ضرورت نہیں......ان کی فکر کسی کو تو کرنی چاہیے....کسی کو تو کرنی ہی ہوگی......اپنی سوچوں کے ساتھ وہ ان تنگ سڑکوں سے نکل کر ایک چوڑی شاہراہ پر آ گئے....جس کے دونوں طرف ہرے بھرے کھیت لہلہا رہے تھے....یہ منظر سابقہ منظر سے بالکل مختلف تھا.... یہاں موسم بہار کی رنگینی اور قدرت کی فیاضی قابل دید تھی....کہیں سرسوں کے پیلے پھول سبز اور زرد رنگ کا ایسا دلکش منظر پیش کر رہے تھے کہ لمحہ بھر میں پچھلے چند لمحوں میں اپجی ذہن کی ساری کدورتیں دھل گئیں..''(24)

کردارنگاری:

اس دنیا میں جتنے بھی انسان ہیں سبھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ کسی کا قد لمبا ہے تو کوئی چھوٹا، کوئی موٹا تو کوئی پتلا، کوئی گورا ہے تو کوئی کالا، کوئی مالک ہے تو کوئی نوکر، کوئی شہری ہے تو کوئی دیہاتی اور بھی بہت ساری چیزیں ہیں جس کے اعتبار سے لوگ جدا جدا ہیں۔ ان سب اختلافات کے باوجود جب ہم کسی ایک طرح کی جماعت کو لیتے ہیں تو اس جماعت کے ہر فرد میں ایک خاص طرح کی خصوصیت اور یکسانیت پائی جاتی ہے۔ اسی خصوصیت کی وجہ سے وہ دوسری جماعت کے افراد سے الگ پہچان رکھتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک ڈاکٹر اور ایک مزدور کے درمیان صاف نمایاں فرق دیکھنے کو مل جاتا ہے۔ ہم دونوں کے لباس سے ان کے بات کرنے کے انداز سے اور ان کے اٹھنے بیٹھنے کے طور طریقے سے بتا سکتے ہیں کہ کون ڈاکٹر ہے اور کون مزدور۔ ناول نگار کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ کسی کردار کی ایسی کردار نگاری کرے کہ اس کے بارے میں پڑھ کر اس کا خاکہ قاری کی آنکھوں کے سامنے آجائے۔ ناول نگار کو کردار نگاری کرتے وقت کردار کے ہر ایک چھوٹی چھوٹی باتوں پر ذہن مرکوز رکھنا پڑتا ہے۔ کردار نگاری کے بارے میں ڈاکٹر محمد احسن فاروقی اور ڈاکٹر سید نورالحسن ہاشمی رقم طراز ہیں:

> ''ادبی ناول نگار زندگی کے صحیح گہرے اور پر اثر نقش بناتا ہے اور اس لئے اس کو سیرت یا کردار نگاری کی خوبی پر کافی توجہ دینا چاہیے۔ ای، ایم فورسٹر کہتے ہیں کہ "ہماری زندگی دو زندگیوں سے مل کر بنی ہے۔ ایک زندگی وقت کے حساب سے اور دوسری کچھ خاص قدروں کے حساب سے۔ لیکن ناول وہی اچھا ہے جس میں دوسرے قسم کی زندگی پر زیادہ زور دیا جاتا ہے" اس کے معنی یہ ہیں کہ ناول کی ادبی اہمیت اس کی کردار نگاری پر منحصر ہے اور اگر کوئی ناول نگار کردار نگاری کی قوت نہیں رکھتا تو وہ صحیح معنی میں ناول نگار کہلائے جانے کے لائق نہیں ہے۔
>
> کردار نگاری کے سلسلہ میں پہلی شرط یہ ہے کہ کردار نگاری کے جیتے جاگتے نقشے ہوں اور ناول پڑھنے والا ان کو بالکل ویسا ہی سمجھے جیسا کہ وہ اپنے گھر والوں یا دوستوں کو سمجھتا ہے یا ان سے ہمدردی اور نفرت کر سکتا ہے اور ناول ختم

کرنے کے بعد بھی ان کا تصور کر کے مزے لیتا رہے۔کسی ناول کے عمدہ کردار
کی یاد ہمیشہ قائم رہتی ہے۔'' (25)

مصنفہ نسترن فتیحی نے ناول کا پلاٹ نہ صرف مضبوط بنیادوں پر استوار کیا ہے بلکہ کردار نگاری اور جزیات عمیق مشاہدے کی بنا پر ترتیب دی ہیں۔ ناول کا مرکزی کردار اجے ورما ہے وہ ایک محنتی اور ذہین طالب علم ہے جو یونی ورسٹی میں ڈین آف فکلٹی کے عہدے تک پہنچنے والا ایک ریسرچ اسکالر ہے۔اس کا سامنا مطلب پرستوں اور سیاست میں جوڑتوڑ رکھنے والوں سے ہوتا ہے۔صرف محنت اور لگن کو سیڑھی بنا کر اوپر جانے والا اجے ورما کا سامنا شارٹکٹ کے ماہر نیک رام سے ہوتا ہے جو ایک دلت سماج سے تعلق رکھتا ہے۔اجے ورما اس نااہل اور عیار قسم کے نیک رام سے پیچھے رہ جاتا ہے۔ جونیئر کلرک سے نوکری آغاز کرنے والا نیک رام ہر طرح سے قابل اور محنتی اصل حقدار اجے ورما کو پیچھے چھوڑتا ہوا یونی ورسٹی کا وائس چانسلر بن جاتا ہے۔مندرجہ ذیل اقتباس میں اجے درما جو کہ ایک پروفیسر ہے اس کے قد وقامت کا ذکر کیا گیا ہے:

'' ان کی با اصول زندگی نے انھیں ایک متناسب جسم اور قد وقامت عطا کیا
تھا.... بال بھی صرف کنپٹیون پر سفید ہوئے تھے اور سامنے ایک موٹی سی سفید لٹ
ان کے وقار میں اضافہ کرتی تھی اور ان سب کے باوجود ان کا نرم وملائم چہرہ جو
ان کے مزاج کی غمازی کرتا تھا، انھیں ان کے عمر سے پانچ چھ سال کم کا ہی لگنے
میں مدد کرتا تھا۔'' (26)

اجے ورما ایک خود دار انسان ہے۔ وہ اپنے کسی کام کے لیے اپنے اصولوں سے سمجھوتا نہیں کرتا ہے۔اس کا یہ ماننا ہے کہ انسان اپنی محنت اور قابلیت کی بدولت ہی کسی مقام پر پہنچے، کسی کی سفارش سے نہیں، اگر وہ اس مقام کا حقدار ہوگا تو اسے مل ہی جائے گا ورنہ اس سے زیادہ بہتر اور قابل انسان کو ملے۔اجے ورما نے اپنی زندگی میں جو کچھ بھی حاصل کیا ہے جس مقام پر بھی پہنچا وہ صرف اور صرف اپنی محنت اور قابلیت کی بدولت پایا ہے۔اس کے دل میں کسی بھی قسم کی لالچ نہیں ہے۔ جب اجے ورما کا نام وائس چانسلر کے لیے چنا گیا تھا تو اس کے دوستوں نے اسے اپنے لیے پیروی اور بھاگ دوڑ کرنے کا مشورہ دیا تھا جسے نہیں کرنے کی وجہ سے ان کی اجے ورما سے شکایت بھی تھی۔ مندرجہ ذیل اقتباس سے یہ بات اور واضح ہو جاتی ہے:

’’ " کیوں پاپا کوئی مسئلہ ہے کیا۔" وجے نے پوچھا۔
" یہی تو مسئلہ ہے کہ کوئی مسئلہ نہیں.... " پھر ہنس کر بولے۔
" مسئلے تو خود ہمارے ذہن کی اختراع ہیں سمجھو تو ہے ورنہ نہیں۔"
" آپ کی پہیلی ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔" سیما نے کہا۔
" وہی احباب کی شکایت انہیں لگتا ہے کہ میں اپنی وائس چانسلر شپ کے لئے
کوشش پیروی، بھاگ دوڑ کروں۔ جو یقیناً میرے بس کی بات نہیں۔" ‘‘(27)

ناول کے آخری دو ابواب " ہر عکس خوں مالیدہ ہے....." اور " ہیلو پروفیسر....." تک پہنچتے مصنفہ نسترن احسن فتیحی نے وقت کی خدوخال کو واضح کرتی ہوئی اسے صحیح معنوں میں اجے ورما، سیما، میتا، راجیش، پاٹھک اور نیک رام کے بالمقابل ایک الگ کردار بنا کر سامنے لے آتی ہیں جہاں ہر کوئی وقت سے لڑتا نظر آتا ہے۔

اس دنیا میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو کم وقت میں زیادہ ترقی کرنا چاہتا ہے۔ ایک قدم چلتا نہیں ہے کہ دوسرے قدم کی فکر ہوتی ہے۔ وہ اپنے کامیابی کو مسلسل پانا چاہتا ہے۔ اسے ملی ہوئی کامیابی سے خوشی ہوتی تو ہے مگر وہ نئی اونچائیوں پر پہنچنے کے لیے ہمیشہ نئے موقع کی تلاش میں رہتا ہے۔ اور جس سے اس کا کام بننے والا ہوتا ہے اس کی خدمت میں اس طرح لگ جاتا ہے کہ اس شخص کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ انسان اس کے لیے کتنا کچھ کر رہا ہے۔ اس طرح کا انسان موٹی چمڑی کا بھی ہوتا ہے اگر آپ کچھ بھلا برا کہہ بھی دیں تو یہ صرف بڑی بے شرمی سے مسکرا کر اس بات کو نظرانداز کر دیتا ہے۔ اس کا ایک واقعہ ناول میں پیش آیا ہے جسے مندرجہ ذیل اقتباس میں دیکھا جا سکتا ہے:

’’ "سب اوپر والے کی کرپا ہے صاحب.... آپ نے ٹکٹ لینے والوں کی بھیڑ کو ونڈا سکرین پر کبھی دیکھا ہے۔ کتنی لمبی لائن ہوتی ہے مگر اسی لائن میں ادھر ادھر سے گھس کر کچھ لوگ پہلے ٹکٹ لے جاتے ہیں اور لائن میں کھڑے لوگ اپنی باری کا انتظار کرتے رہتے ہیں...." نیک رام نے بڑے فخر سے کہا۔
" اچھا تو تم ادھر ادھر سے گھسنے والوں کی طرح ہو....."
" بس سر.... اب لائن میں لگنے کی چھمتا (صلاحیت) مجھ میں نہیں ہے اسی لیے اپنا کام ایسے ہی نمٹا لیتا ہوں۔ ہاں ایسے میں دو چار گالیاں ملتی ہیں..... مگر ان پر دھیان دے کر اپنا سمے خراب نہیں کرتا۔" ‘‘(28)

مذکورہ بالا اقتباس میں پیش آئے خوبیوں سے بھرا ہے ناول کا کردار نیک رام جو ہمیشہ اسی طرح کے موقع کی تلاش میں رہتا ہے۔ نیک رام اس ناول کا دوسرا مرکزی کردار ہے جو منفی رویوں سے بھرا ہے۔ وہ اپنی نوکری کے ابتدائی دور میں خوش آمد مطلب پرستی اور ابن الوقتی کو اپنے ترقی کا راستہ بناتا ہے تو بعد میں دلت سماج کے سیاست سے مستفید ہوتا ہے۔ ایک چھوٹے سے واقعے کو سورنوں کے ذریعے دلتوں کے استحصال کا سیاسی نعرہ دے کر ایک سیاسی جنگ چھیڑ دیتا ہے۔ سیاسی لیڈر بھی اس معاملے کو دلت سیاست کرنے کا موقع سمجھتا ہے اور اسے اپنے مفاد کے لیے استعمال کرتا ہے۔ یوں ذات پات کا نظام جامعات میں محنت اور قابلیت کو پیچھے چھوڑتا نظر آتا ہے۔ اور ذات پات کا سیاسی نعرہ حقدار کو اس کے جائز حق سے محروم کر دیتا ہے۔

ناول میں مصنفہ نے اپنے کردار کو ان کی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ آزاد چھوڑ دیا ہے۔ کردار خود وقت کے ساتھ اپنے نقوش واضح کرنے لگتا ہے۔ ناول میں پیش آنے والے کردار افعال، مکالمات، کردار نگاری اور جزئیات کے ذریعے قاری تک پہنچتا ہے۔ اس ناول میں مصنفہ نے اپنے کرداروں کو کسی جادوئی ٹائپ سے ایک مقام سے دوسرے مقام پر پہنچانے میں کسی طلسم کا شکار نہیں ہونے دیا۔ ان کی زندگی میں خوش نصیبی کی کوئی لاٹری نہیں لگتی بلکہ یہ کردار اپنی سعی سے ہی اس معاشرے میں قدم جمانے میں کامیاب ہوتا ہے۔ اور اس ناول کے نمائندہ کردا راجے ورما، میتا اور راجیش بہت جدوجہد کے بعد کامیابی حاصل کرتا ہے اگر چہ اس ناول کا مرکزی کردار عورت نہیں مگر اس ناول کے دیگر کرداروں میں نمایاں نظر آنے والی عورتیں میتا اور سیما تانیثی بیانیہ کی عمدہ مثال ہیں وہ انقلاب اور فرسودہ روایات سے بغاوت کرنے والی ہیں۔

اس ناول میں ایک ایسی گھریلو عورت کا کردار ہے جو ہمارے آس پاس پائی جاتی ہے۔ اس کی خوبیوں کو دیکھ کر ہمیں کسی طرح کی حیرانی نہیں ہوتی ہے۔ کیوں کہ ہم ایسے ہی ماحول میں رہتے ہیں۔ ناول کا ایک کردار سیما جو اجے ورما کی بیوی ہے اس کے بارے میں نیچے دیے گئے اقتباس سے اندازہ ہو جائے گا کہ وہ کس طرح کی عورت ہے اور اس کی خوبی کیا ہے:

''"بھابھی، جانتی ہیں....؟ پہلے مجھے آپ پر بہت رشک آتا تھا۔"

"کیوں...."

"اس لیے کہ آپ کو اتنے اچھے پتی ملے ہیں،مگر اب سر پر رشک آتا ہے کہ انہیں اتنی اچھی پتنی ملی ہیں۔"''(29)

اس ناول میں ایک اور نسائی کردار کو پیش کیا گیا ہے جو ایک لڑکی ہونے کے باوجود بھی بہت بہادری سے زمانے سے لڑتی ہے۔ وہ یہ نہیں سوچتی ہے کہ اگر وہ کسی ظلم وستم کے خلاف اپنی آواز بلند کرتی ہے تو اس کا ساتھ دینے کے لیے کوئی کھڑا ہوگا یا نہیں؟ اس کے ساتھ اس ظلم وستم سے لڑے گا یا پھر ایک ڈرپوک انسان کی طرح اسے ہی سمجھانے کی کوشش کرے گا کہ وہ لڑکی ہو کر ایسا کام نہ کرے۔ وہ اپنے اوپر ہونے والے جبر کے خلاف آواز اٹھاتی ہے اپنے مستقبل کو لے کر بہت سنجیدہ ہے اور پنی بات کو اپنے خیالات کو صرف اپنے دل کے اندر ہی نہیں رکھتی ہے بلکہ اسے دنیا کے سامنے رکھتی ہے۔ وہ ایسے لوگوں کے سامنے بھی اپنی بات کو بے جھجھک رکھتی ہے جو اس کے مزاج کے بالکل الٹ ہیں اور اس کی سوچ سے بہت دور تک بھی میل نہیں کھاتی۔ ایسی ہی خوبیوں سے بھرا ہے ییتا کا کردار۔ جس کا اندازہ نیچے کے اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے:

''"میری سمجھ میں نہیں آتا تمھیں اتنی جلدی کیوں ہے....مجھے سکون سے ریسرچ مکمل کر لینے دو۔" ییتا کا صبر آخر کار جواب دے گیا۔

"اس کا کوئی انت ہے....؟ کل کہو گی کچھ سال نوکری کر لینے دو...." انل نے گمبھیر آواز میں کہا۔تو ماحول کی ساری سنگینی کے باوجود ییتا کو ہنسی آ گئی۔

"ہاں انل میں نوکری بھی کروں گی،مگر شادی کے بعد...".

"یہ مجھے منظور نہیں....." انل اب بھی سنجیدہ تھا۔

" کیا مجھ سے شادی یا میری نوکری۔"

"ییتا یہ مذاق کی بات نہیں، میں بھی تم سے کتنی بار کہہ چکا ہوں کہ شادی کے بعد مجھے تمھارا نوکری کرنا پسند نہیں.....مجھے ایسی زندگی پسند نہیں جس میں...."

"بس انل رہنے دو....ہم دو ٹمپرامنٹ (مزاج) کے لوگ ایک ساتھ اتنی لمبی زندگی نہیں گزار سکتے۔تم ایسے نہیں رہ سکتے میں ویسے نہیں رہ سکتی....بات ختم۔"

اور بات سچ مچ ختم ہو گئی....انل اٹھ کر چلا گیا.....دوسرے دن جب وہ گھر سے رخصت ہو رہی تھی تو ہمیشہ کی طرح ماں، بابا نے آشرواد کے لیے ہاتھ نہیں

اٹھایا...دادا اٹھ کر کمرے میں چلے گئے اس کے ساتھ اسٹیشن تک نہیں آئے...
بھابھی نے منھ دوسری طرف گھما لیا اور وہ اتنے ڈھیر سارے اپنوں کا پیار اس بار
ہار آئی۔مگر اسے یقین تھا کہ وہ ایک دن سب کو منا لے گی...''(30)

ہندستان بہت بڑا ملک ہے۔ایک ایسا ملک ہے جہاں کئی مذاہب کے ماننے والے لوگ رہتے ہیں جیسے ہندو، مسلم، عیسائی، سکھ، جین، بودھ وغیرہ۔مختلف صوبوں میں مختلف ثقافت کے لوگ رہتے ہیں جیسے بنگالی، آسامی، منی پوری، تمل، ملیالی، تلگو، مراٹھی، پنجابی، گجراتی، اڑیہ، راجستھانی وغیرہ۔مختلف طبقات کے لوگ رہتے ہیں امیر اورغریب۔ان سب کا کھانا پینا، کپڑا اور رہن سہن ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔سب کا ایک خاص انداز ہے۔ نسترن احسن فتیحی نے کردار نگاری کرتے وقت ان سبھی باتوں کا بھی پورا خیال رکھا ہے۔اس کا اندازہ مندرجہ ذیل اقتباسات سے لگایا جا سکتا ہے جس میں بڑا بابو اور بیتا کے کپڑے کا ذکر آیا ہے:

''"ارے نیک رام تم یہاں ہو میں آج صبح سے تمھیں ڈھونڈ رہا ہوں۔" یہ
بڑا بابو کی آواز تھی جو سفید کرتا پائجامہ میں پان چبائے سرخ ہونٹوں کے ساتھ
ابھی ابھی اندر آئے تھے''۔(31)

''"ٹھیک ہے، میں بس پانچ منٹ میں نکلتی ہوں۔" یہ کہہ کر بیتا تیار ہونے
چلی گئی۔اور جب اپنی مخصوص انداز کی کاٹن کی بلو بارڈر والی ساڑی پہن کر نکلی تو
چند لمحوں پہلے والی اداسی اور ناامیدی کی ہلکی سی جھلک بھی اس کے چہرے پر نہیں
تھی...''(32)

مذکورہ بالا اقتباس سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ مصنفہ نے اپنے کردار و کو پیش کرتے وقت نہ صرف اس کے قد و قامت کا خیال رکھا ہے بلکہ انھوں کردار نگاری کرتے وقت اس کے ماحول اور ثقافت کا بھی پورا پورا خیال رکھا ہے۔ انھوں نے اپنے ناول میں کردار کے پہناوے کا بھی ذکر موقع نکال کر کیا ہے تاکہ قاری بہ آسانی کردار کو سمجھ پائے۔

پلاٹ:

ایک اچھے ناول کا پلاٹ آپس میں گتھا ہوا ہوتا ہے۔ناول اپنے پلاٹ کے ذریعے ہی آگے بڑھتا ہے۔ پلاٹ میں کہانی اس طرح بیان کی جاتی ہے کہ اس سے ناول کو پڑھنے کی چاہت قاری میں بڑھتی ہے۔ پلاٹ میں

ناول کا قصہ ایک کے بعد دوسرے سے ترتیب وار جڑا ہوتا ہے۔اس میں بے ترتیبی نہیں ہونی چاہیے۔اگر بے ترتیبی ہوگی تو اس ناول کو کامیاب ناول نہیں کہہ سکتے۔داستانوں میں قصہ کو طول دینے کے لیے اس میں کسی طرح کی ترتیب نہیں ہوتی اس کا قصہ ادھر ادھر بے ترتیب نظر آتا ہے مگر ناول میں اسے برائی سمجھا جاتا ہے۔ناول کے پلاٹ کے بارے میں ڈاکٹر محمد احسن فاروقی اور ڈاکٹر سید نور الحسن ہاشمی یوں رقمطراز ہیں:

''ناول کا پلاٹ قصے کی ترتیب سے تعلق رکھتا ہے۔پلاٹ میں بھی واقعات کا بیان ہوتا ہے مگر اس میں سبب اور مسبب کے مطابق ترتیب پر زیادہ زور ہوتا ہے۔ پلاٹ بنانا ایک قسم کا فنِ تعمیر ہے اور اچھے پلاٹ والے ناول کا ہر حصہ اس طرح تعمیر ہوتا ہے جیسے کسی عمارت کے الگ الگ حصے ایک سیدھے سے ۔پلاٹ کے عموماً پانچ حصے ہوتے ہیں۔ پہلے حصے میں تمام کرداروں کا تعارف ہو جاتا ہے۔ دوسرے حصہ میں ان کرداروں کے معاملات میں گتھیاں پڑنے لگتی ہیں۔تیسرے حصہ میں گتھیاں اس درجہ اُلجھ جاتی ہیں کہ ان کا سلجھنا محال معلوم ہونے لگتا ہے، چوتھے حصہ میں یہ سب گتھیاں سلجھنے لگتی ہیں اور پانچویں حصہ میں تمام معاملات خاتمہ پر پہنچ جاتے ہیں۔'' (33)

اس ناول میں کردار، ماحول، مکالمے، زبان و بیان مل کر ایک بہترین پلاٹ کی تشکیل دیتے ہیں۔ پلاٹ میں یونی ورسٹی کیمپس کی تہذیب و تمدن کو نہایت ہی خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اور قاری کو ناول پڑھتے وقت نامناسب یا چونکانے والی چیزیں معلوم نہیں ہوتیں۔ناول میں ان ہی باتوں اور واقعات کا ذکر آیا ہے جو اس ملک کی یونی ورسٹی میں رائج تہذیب کا حصہ ہے۔نوکری پانے کے لیے محنتیں اور کوششیں آج کل کچھوئے کی چال اور اس کی ڈھال معلوم ہوتی ہیں جو بظاہر تو آگے بڑھتا ہے لیکن لمبا وقفہ اس انتظار میں گزر جاتا ہے کہ کب نوکری لگے، کب ترقی ہو۔اجے ورما اپنے شاگردوں کو اکثر نیک مشورے اور حوصلے دیتا رہتا ہے جو ان کے لیے زادراہ ثابت ہوتا ہے اور ناول کو آگے بڑھانے میں ایک کامیاب پلاٹ کی بھی تشکیل کرتا ہے۔اسے مندرجہ ذیل اقتباس میں پیش کیا جارہا ہے:

''"تم نوجوانوں کو بہت کچھ کرنا چاہیے۔ان مسائل پر قابو پانے کے لیے تم

لوگوں کوآگے بڑھ کر کچھ کرنا چاہیے۔ بہت مواقع ہیں کام کرنے کے اگر جذبہ ہو تو......اخراجات اور آمدنی کے لحاظ سے ہماری دنیا بے پناہ غیر متوازن ہو چکی ہے۔ یہ قلیل مدتی بحران طویل بحران کا ہی حصہ ہے۔ اور سب سے افسوسناک بات یہ ہے کہ ہمارے حکمراں اپنی آسائشوں میں ایسے گم ہیں کہ اگر ہم ہندوستان کی تاریخ مرتب کریں تو ان لیڈران کی چالاکی کے ساتھ فیاضانہ ناجائز انتفاع کی مکمل سرگزشت پیش کر سکتے ہیں۔ آج کے حکمراں اپنے پیچھے سیاسی چالبازیاں، خودغرضی، خودنمائی اور خود پرستی کی تاریخ اپنے پیچھے چھوڑ کر جانے والے ہیں۔"

راجیش کو لگا اجے ورما بولتے بولتے کسی قلبی انتشار کی کیفیت میں مبتلا ہو گئے ہیں.....اگر ذات کے غم پر زمانے کا غم حاوی ہو جائے تو انسان کا قد کتنا بلند ہو جاتا ہے۔"'' (34)

جامعات ہوں یا مرکزی سرکار کی اٹھا پٹک یہ رجعت پرستی دھیرے دھیرے ملک اور ہمارے ماحول کا حصہ بن چکی ہے۔ روایات اقدار اور معاشرے کی اجتماعی سوچ میں نمایاں تبدیلیاں وقوع پزیر ہو چکی ہے جسے کڑھتے ہوئے قبول کرنے کے سوا حساس لوگوں کے پاس اور کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔ اشتعال انگیز باتیں کرنا بہت آسان کام ہے، دلوں میں کینا اور بغض رکھنا بھی انسان کی جبلت میں شامل ہے۔ انسان کے پاس ایک ایسی چیز ہے جو انسان کو حیوان سے الگ کرتی ہے۔ اس کے بغیر انسان مکمل انسان نہیں ہوسکتا اور وہ ہے حس، اگر انسان حس کا استعمال کرے تو وہ ان ساری چیزوں سے اوپر اٹھ کر سوچ پائے گا اور دیکھ پائے گا چاہے اس کے آنکھوں پر چڑھا چشمہ کسی بھی فرقہ، نسل، مذہب اور رنگ کا ہو اس کی فکر کو محدود نہیں کر پائے گا۔ حس کو استعمال کر کے پلاٹ تیار کیا گیا ہے جس کے ذریعے ناول کی کہانی آگے کی طرف بڑھتی ہے۔ کچھ پڑھے لکھے طبقے کے لوگ بھی اپنے مذہب کی اندھی تقلید کرتے نظر آتے ہیں ان کے سامنے انسانیت کا کوئی مول نہیں ہوتا۔ ایسے ہی لوگوں کے حس کو جگانے کے لیے نسترن فتیحی نے ناول میں اسے پیش کیا ہے۔ جسے مندرجہ ذیل اقتباس میں دیکھا جاسکتا ہے:

''"اور آپ مت بھولیے کہ ماضی میں ایک غلط فیصلہ ہوا جس کا خمیازہ صرف اس وقت کے لوگوں نے نہیں بھگتا بلکہ آنے والی نہ جانے کتنی نسلیں اس کا خمیازہ

بھٹکتی رہیں گی۔ کشمیر کا جھگڑا، اسی فیصلے کی مرہون منت ہے اور وہ فیصلہ بھی کچھ سیاست دانوں کی مفاد پرستی پر ہی ہوا تھا۔مگر یہ کہاں کی عقلمندی ہے کہ ایسی غلطیوں کو لوگ دہراتے رہیں اور ہر زمانے میں اس کی اندھی تقلید ہوتی رہے۔اس وقت جناح کی ایک غلطی نے پچاس سال سے خون کی ہولی کا رواج عام کیا تو چلتا چلا آ رہا ہے۔آج بالکل اسی طرح کی غلطی یہ وشو ہندو پریشد والے کر رہے ہیں....اب دیکھیے مندر مسجد کے جھگڑے کی اس بنیاد میں کتنے معصوموں کے خون کی بھینٹ دی جائے گی۔"''(35)

یونی ورسٹی چوں کہ بڑے بچوں اور طالب علموں کے لیے بنی ہے اور اس میں پڑھنے والوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ طالب علم نوجوان اور جوشیلے بھی ہوتے ہیں۔ بہت جلد کسی چیز کی طرف بغیر سوچے سمجھے قدم اٹھا لیتے ہیں۔اس لیے یہاں انتظامیہ ہمیشہ صبر و استقلال کے ساتھ اپنے طالب علموں سے سلوک کرتی ہے۔مگر پھر بھی دونوں کے بیچ ٹکراؤ ہو ہی جاتا ہے۔انتظامیہ اور طالب علموں کے درمیان جو ٹکراؤ پیدا ہوتا ہے وہ کہانی کو آگے بڑھانے میں مدد کرتی ہوئی نظر آتی ہے اور ایک پلاٹ کی شکل میں ناول کو مدد کرتا ہے۔ مندرجہ ذیل اقتباس میں ہم دیکھ سکتے ہیں کہ مصنفہ نے کس طرح اپنے ناول میں پلاٹ کی تشکیل کی ہے اور یہ ناول کو آگے بڑھانے میں کیسے مدد گار ثابت ہوتا ہے:

''وہ یونیورسٹی کے پرسکون ایسیڈینشیل ایریا سے نکل کر ہوسٹل کی طرف بڑھ رہے تھے تاکہ انھیں حالات کا اندازہ ہو سکے کہ طالب علموں نے کل رات پھر کچھ ہنگامہ تو نہیں کیا..... یہ ہنگامہ پچھلے تین دنوں سے چل رہا تھا........ بات صرف یہ تھی کہ دو طالب علموں کی آپسی لڑائی پر ایک چاقو سے زخمی ہوا اور سزا کے طور پر یونیورسٹی انتظامیہ اور وی سی نے دونوں کو معطل (Suspend) کر دیا تھا۔اس کے بعد ان لڑکوں کا خیر خواہ گروپ انھیں واپس لینے کے لیے پہلے کلاسز ڈسٹرب کرتا رہا اور جب اس پر سنوائی نہیں ہوئی تو توڑ پھوڑ اور تشدد پر اتر آئے۔انتظامیہ بڑے صبر و استقلال سے حالات کو قابو میں کرنے کی کوشش کر رہی تھی مگر کچھ فاسق و فاجر قوتیں بجھتی ہوئی آگ میں

تیل ڈال جاتیں اور نئی عقل جس میں جوش زیادہ اور ہوش کم تھا، نئے ولولے کے ساتھ ہنگامہ کھڑا کردیتی۔'' (36)

ناول کے پلاٹ کا جب ہم باریک بینی سے مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں یہ دیکھنے کو ملتا ہے کہ اس کا پلاٹ ناول کی کہانی کو آگے بڑھانے میں مدد کرتا ہے۔ اس ناول کا پلاٹ آپس میں گتھا ہوا ہے۔ پلاٹ کے سہارے ہی ناول آگے بڑھتا ہوا بغیر کسی کمی یا رکاوٹ کے اختتام پذیر ہوتا ہے۔ اس میں کہیں بھی ایسا نہیں لگتا ہے کہ اس میں کسی طرح کی کمی ہے یا کہانی کہیں پر دم توڑ رہی ہے۔ اس کی ایک مثال ہم نیچے آئے اقتباس میں دیکھ سکتے ہیں جس میں ڈاکٹر (J.D.O.s) دھرنے پر بیٹھے تھے اور ایڈمیشن نہیں لے رہے تھے۔ یہاں سے کہانی کا پلاٹ تیار ہوتا ہے اور آگے کس طرح دھرنا ختم ہوتا ہے اور اس کے لیے کیسی کیسی پریشانی پیش آتی ہیں اور کہانی کس طرح آگے کی طرف بڑھتی ہے اسے آسانی سے دیکھا جا سکتا ہے:

''ڈپارٹمنٹ میں معلوم ہوا جونیئر ڈاکٹرز دھرنے پر بیٹھے ہیں۔ کل سے ان کا ایم ایس کا اڈمیشن شروع ہونے والا تھا مگر پسند کی برانچ نہ ملنے پر اور اپنا دوسرے برانچ میں ٹرانسفر کروانے پر انھیں ایک سال تک یونیورسیٹی نے جو ادائیگی (Payment) کی ہے وہ ساری رقم لوٹانی پڑے گی.... اس لیے جے ڈی اوز (J.D.O.s) ناراض تھے اور ایڈمیشن نہیں لے رہے تھے۔'' (37)

اس ملک کے کچھ دفاتر میں یہ دیکھنے کو ملتا ہے کہ اس میں کام کرنے والے لوگ ایک دوسرے کی کامیابی سے حسد کرتے ہیں اور جہاں موقع ملتا ہے اسے نیچے کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔ خاص کر سرکاری دفاتر کا حال بہت برا ہے۔ اس معاملے میں اسکول سے یونی ورسٹی تک ایک جیسا ماحول ملتا ہے۔ جسے لوگ عام طور پر سیاست کا نام دے دیتے ہیں۔ آپ کے پاس اگر اختیار ہے تو آپ اس اختیار کا غلط فائدہ بھی اٹھا کر کسی کو آگے بڑھنے سے روک سکتے ہیں۔ مندرجہ ذیل اقتباس میں نسترن فتیحی نے کہانی کو آگے بڑھانے کے لیے یہ بات واضح کی ہے کہ اجے ورما کامن پولیٹکس کی وجہ سے اوب گیا ہے اور مینا کو گپتا صاحب نے انٹرویو لیٹر جاری ہونے نہیں دیا۔ اس کے بعد دونوں کرداروں کی کہانی آگے کی طرف چلتی ہے:

''"اس یونیورسٹی کی پولٹیکس سے من کچھ اوب رہا ہے اس لیے جانا تو چاہتا
ہوں... جانتی ہو بیتا کو داس صاحب اور گپتا صاحب نے اس بار انٹرویو لیٹر ہی
نہیں ایشو ہونے دیا ہے۔"''(38)

تحفہ کا رواج بہت پرانا ہے۔ ہمارے ملک میں بھی لوگ خوشی کے موقع پر ایک دوسرے کو تحفہ دیتے آئے ہیں خاص کر کسی تیوہار میں جب ہم کسی کے گھر ملنے جاتے ہیں۔ آج کل ایک نیا سلسلہ شروع ہو گیا ہے کہ جب ہم کسی دوست یا رشتہ دار کے گھر جاتے ہیں تو ہم کچھ تحفہ لے کر جاتے ہیں۔ یہاں جب ہم تحفہ لے کر جاتے ہیں تو اس میں پیار اور محبت ہوتی ہے۔ مگر آج کل ایک اور نیا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ قیمتی تحفہ کو اچھے سے پیک کر کے دیتے ہیں تا کہ جسے تحفہ دیا جائے وہ تحفہ کی فوقیت سے باخوبی واقف ہو جائے اور اس کو اپنے لیے خوش بختی سمجھے اور اس کے ہر کام میں مدد کرے اور تحفے کی وجہ سے اس کے احسان تلے دبا رہے۔ دراصل ایسا تحفہ پیار سے خالی ہوتا۔ اس طرح کے تحفے کو اگر ہم ایک نام دینا چاہیں تو اسے رشوت کا نام دے سکتے ہیں۔

ہمارے ملک ہندستان میں جب انسان کسی اچھے سرکاری عہدے پر ہوتا ہے اور اس کے پاس کسی کام کو کرنے کا اختیار ہوتا ہے تو اس سے نزدیکی بنانے کے لیے اپنا کام کرانے کے لیے لوگ اسے قیمتی تحفے دیتے ہیں۔ ان کے پاس عموماً ایسے ہر لوگوں کا تحفہ آتا ہے جسے وہ کبھی ملے بھی نہ ہوں اور نہ جانتے ہوں، دراصل وہ تحفہ نہیں رشوت ہوتی ہے۔ ہندستان میں زیادہ تر معاملوں میں سرکاری کام کو لینے کے لیے رشوت ایک عام چیز ہے۔ اس لیے لوگوں کے دل و دماغ میں یہ بات سما گئی ہے کہ اگر ہم نے رشوت نہیں دی تو شاید وہ اس کام کو لینے کا پورا حقدار ہوتے ہوئے بھی اس سے محروم ہو جائے گا مگر اس ملک میں ایسے بھی لوگ ہیں جو صرف ایمانداری کا پیسا کماتے ہیں اور رشوت نہیں لیتے۔ اپنا کام پوری ایمانداری سے بغیر کسی طرح کی رشوت لیے کرتے ہیں۔ مگر ایسے لوگوں کے لیے اس راستے پر چلنا آسان نہیں ہوتا ہے۔ اسی صورت حال کو بیان کرتا ہے ناول کا یہ اقتباس:

''"ہاں سیما..... یہ تحائف نہیں .....رشوت ہے تم نہیں جانتی ابھی کانفرنس
روم کے لیے کرسی بنوانے کا آرڈر پاس ہونے والا ہے۔ فائل میری ٹیبل پر پڑی
ہے۔ ابھی میں نے سائن نہیں کیا ہے۔ ساتھ ہی اسٹافس کے لیے کولر اور روم ہیٹر
کا آرڈر بھی پاس ہونے والا ہے۔ یہ ایک گھر کی خریداری کا مسئلہ نہیں.... لاکھوں

کے کانٹریکٹ کا سوال ہے۔" اجے بہت متفکر نظر آنے لگے۔''(39)

اسلوب:

کسی ایک ہی انسان کے بارے میں مختلف اوقات پر الگ لگ لوگوں کا سوچ مختلف ہو سکتی ہے یا پھر وقت کے تغیر کے ساتھ بدل جاتی ہے۔ اس کی بہت ساری وجہ ہو سکتی ہیں۔ اس میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ جس کے بارے میں رائے دی جا رہی ہے واقعی اس میں وقت کے ساتھ تبدیلی آئی ہو۔ یہ تبدیلی اچھی بھی ہو سکتی ہے اور بری بھی۔ ایسا ہی حال پیش کرتا ہے مندرجہ ذیل اقتباس جسے مصنفہ نے سادہ اسلوب کے ساتھ سیدھے الفاظ میں عام فہم طریقے سے پیش کیا ہے:

> ''اس کی بیوی سیما کہتی ہے۔
> " آپ کے جیسا پریکٹیکل آدمی شاید ہی کوئی ہوگا۔" جبکہ اس کے محسن اس کے استاد کہا کرتے تھے.... "بہت امپریکٹیکل لڑکا ہے" جیسے یہ کل ہی کی بات ہو... کل اور آج میں اتنا تضاد کیوں آیا... یہ کبھی اس نے سوچا نہیں مگر کچھ کچھ اندازہ تو ہے... شاید وہ آج میں اتنا ڈوب جانا چاہتا ہے کہ کل کو بھول سکے۔''(40)

ہمارے ملک اور سماج میں آج بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو پڑھے لکھے ہیں۔ ان کا رتبہ سماج میں اچھے لوگوں کی ہے، اچھی جگہ اچھے عہدے پر نوکری کرتے ہیں۔ ان کے ذہن اور دل میں مسلمانوں کے لیے کینہ اور زہر بھرا ہوا ہے۔ انھیں جب بھی موقع ملتا ہے ان کو نیچا دکھانے کے لیے ان سے الجھتے رہتے ہیں۔ اس کے برعکس ایسے لوگ بھی ہیں جوان جیسے لوگوں کو سمجھاتے ہیں کہ اس طرح کسی انسان یا مذہب کے ساتھ بری سوچ کا شکار ہونا غلط ہے۔ مصنفہ نسترن احسن فتیحی نے اس طرح کی بات کو بھی سادہ اسلوب اور آسانی سے سمجھے جانے والے انداز میں اپنے ناول میں پیش کیا ہے۔ اسے مندرجہ ذیل اقتباس میں دیکھا جا سکتا ہے:

> '' " آپ صحیح کہہ رہے ہیں ملک صاحب.... صدیوں سے یہی ہوتا آیا ہے.... جب لوگ سیاست دانوں کی شہ پر بڑھتی ہوئی تنگ نظری اور تعصب کا شکار ہو رہے ہیں اب سے پہلے بھی تاریخ میں ایسے واقعات رونما ہوئے ہیں اور دنیا سخت مذہبی گروہ بندیوں کا شکار ہوئی ہے اور اس کا خمیازہ عام معصوم عوام نے

اٹھایا ہے۔ مذہب کے خلاف سب سے بڑے جرم کا ارتکاب تو یہ سیاست دان
ہی کرتے ہیں۔ جو معصوم دلوں اور ذہنوں کو تعصب سے آلودہ کر دیتے ہیں۔ ہر
طرف کٹڑپن کا رواج اور رواداری کا فقدان ہوتا جارہا ہے۔ جس کا اثر یہ ہوا کہ
انسانیت کا زوال شروع ہو گیا ہے۔ چند مفاد پرست لوگوں کی وجہ سے ذہن اور
ہمارے گرد و پیش کا ماحول آلودہ ہو گیا ہے اور افسوس کہ سب جانتے ہوئے بھی
ہم خود کو اس سے بچا نہیں پاتے۔" اجے ورما نے کہا۔''(41)

ہمارے تعلیمی ادارے خاص کر یونی ورسٹی میں اسٹوڈنٹ یونین کو اس لیے بنایا جاتا ہے کہ طالب علم اور انتظامیہ میں اگر کسی بات کو لے کر معاملہ بگڑتا ہے تو یہ یونین ہی انتظامیہ سے بات کرتی ہے اور اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس طرح یونین ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔ مگر کبھی کبھی کچھ مفاد پرست لوگ اس یونین پر قابض ہو جاتے ہیں یا پھر اسے کمزور کر دیتے ہیں۔ اور اپنی من مانی کرتے ہیں اور غنڈہ گردی کرنے لگتے ہیں۔ اس طرح کے طاقتور لوگ ہمارے لیے خطرہ ہیں۔ اس طرح کے لوگ دونوں سمت ہوتے ہیں انتظامیہ میں بھی ہمیں ایسے لوگ مل جاتے ہیں جو آپس میں پھوٹ ڈال کر اپنی بات منوانا چاہتے ہیں۔ جسے مندرجہ ذیل اقتباس میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس میں مصنفہ نے بات سیدھے طریقے سے اور سادہ اسلوب کے ساتھ ہمارے سامنے پیش کیا ہے:

''"حیرت ہوتی ہے صاحب جولڑ کا کل تک اسٹوڈنٹ یونین سے باہر رہ کر
بھی ان کی طاقت تھا آج وہ یونین فرنٹ کی فاؤنڈیشن صرف اس لیے مضبوط
نہیں ہونے دیتا کہ اس کی پارٹی کا دیوالہ نکل جائے گا۔ اور یہ پیسے کھا کھا کر ان
کی جڑیں کاٹتا ہے۔" چوبڑا صاحب نے بات پوری کی۔''(42)

یہ انسانی فطرت ہے کہ جب دو انسان ایک دوسرے کے ساتھ وقت گزارتا ہے اور دونوں کی سوچ میں یکسانیت ہوتی ہے تو وہ ایک دوسرے کے قریب آجاتے ہیں اگر دو جوں کا جنس الگ الگ ہو تو اس صورت حال میں ایک دوسرے سے عشق بھی ہو جاتا ہے۔ جب یہ احساس ہو کہ آگے دونوں کا ساتھ رہنا بہت مشکل ہوتا جارہا ہے۔ خاص کر جب دونوں کے درمیان اپنے ماں باپ اور مذہب کا معاملہ آجائے تو انسان کو چاہیے کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے دوری بنائے۔ نہیں تو یہ نزدیکی کئی سارے اپنوں سے دوری بنا دیگی۔ اسی کو بیان کرتا ہے مندرجہ ذیل اقتباس:

''وہ تو بہت نرم دل، نرم طبیعت کا مالک تھا....اس کے دل میں اپنے مذہب کے ساتھ ساتھ آسی کے مذہب کا احترام بھی موجود تھا۔ اسی لیے وہ نہ تو اپنا مذہب چھوڑنا چاہتا تھا نہ ہی آسی سے چھوڑنے کے لیے کہنا چاہتا تھا۔ اسی لیے دونوں نے خاموشی سے اس کڑوی کسیلی حقیقت کا زہر پی لیا تھا...اور چپکے سے الگ الگ منزلوں کی طرف مڑ گئے تھے....''(43)

اصول پسند انسان بھی آخر انسان ہی ہوتا ہے۔ چوں کہ وہ انسان ہے تو اس کے اندر بھی ایک حد ہوتی ہے جہاں پہنچ کر وہ کمزور پڑنے لگتا ہے۔اس کمزوری کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں۔کبھی کسی کے محبت میں،کبھی حالات کے دباؤ میں،کبھی اپنی بے بسی کی وجہ سے اپنے اصولوں سے تھوڑی دیر کے لیے درکنار ہو جاتا ہے۔کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی بہت قابل اور ہر لحاظ سے لائق انسان اپنی ہر کوشش سے سیدھے راستے کامیاب نہیں ہیں ہو پاتا ہے۔ وہ صرف اس لیے کامیاب نہیں ہو پا رہا کہ اسے پیچھے چھورنے والا غلط طریقے سے آگے نکل کر کامیاب ہو رہا ہے۔ ایسے لوگوں کو کامیاب کرنے کے لیے اگر اصول پسند انسان کو تھوڑی دیر کے لیے اپنے اصول کو درکنار کرنا پڑے تو اس میں کوئی برائی نہیں ہے مگر اس اصول پسند انسان کو ہمیشہ اس بات کی پریشانی رہتی ہے کی کہیں یہ بات کسی کو پتہ نہیں چل جائے کہ اس نے اپنے اصول کو درکنار کیا تھا۔اسی طرح کی حالت کو مصنفہ نے اپنے ناول میں سادہ اسلوب اور سادہ لفظوں میں بیان کیا ہے جسے مندرجہ ذیل اقتباس میں دیکھا جا سکتا ہے:

''ممکن ہے یہ اس انداز میں اجے ورما پر چوٹ کر رہے ہوں کہ وقت پڑنے پر اصول پرست لوگ بھی اپنے سارے اصول بھول جاتے ہیں....یقیناً انھیں یہ خبر مل گئی ہوگی کہ کھنا صاحب کی مہربانی کا فائدہ اٹھا کر انھوں نے راجیش کی بحالی کروالی ہے۔''(44)

ناول اپنے پلاٹ، موضوع، کردار نگاری، اسلوب، مکالمہ نگاری، منظر نگاری ہر اعتبار سے ایک کامیاب ناول ہے۔ مصنفہ نسترن احسن فتیحی نے سادہ سلیس، کم لفظوں میں بڑی بڑی باتیں کہنے میں کامیاب ہوئی ہیں۔ ناول میں مارکس کے فلسفے کو بھی محسوس کیا جا سکتا ہے اور اس کی نمائندگی ناول کا مرکزی کردار اجے ورما نے کیا ہے۔ اس ناول میں مصنفہ نے بڑی فن کاری کے ساتھ صارفیت زدہ تہذیب اور بدعنوانی جیسے جدید اور مہلک مرض کا

انکشاف کیا ہے۔جن باتوں کی جانب ناول میں اشارے کیے گئے ہیں اس کی واضح صورتیں ہمارے معاشرے میں موجود ہیں۔نسترن احسن کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے بدعنوانی جیسے مہلک مرض کا دائرہ یونی ورسٹی کے اندر تک دکھایا ہے لیکن اس کے اثرات سے کس طرح زندگیاں متاثر ہوتی ہیں اس کی جانب واضح اشارے ضرور کر دیے ہیں۔ بہر حال یونی ورسٹیاں لوگوں کو انسان بنانے کی فیکٹریاں ہیں۔جیسا فریم یا فرما ہوگا ویسی ہی چیز برآمد ہوگی یعنی کہ جیسا یونی ورسٹی کا ماحول، استاد، انتظامیہ ہوں گے ویسا ہی طالب علم بھی بنے گا اور ملک کا مستقبل بھی ویسا ہی ہوگا۔ کیوں کہ یونی ورسٹی میں ہی ملک کے مستقبل کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔

یہ مصنفہ کی باریک بینی ہی ہے کہ اس نے رشوت اور ریزرویشن جیسے حساس موضوعات کو اپنے ناول میں بڑی آسانی وعمدگی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ساتھ ہی ساتھ ہندستانی معاشرے میں پھیلے ریزرویشن سسٹم کے برے اثرات پر صاف طور پر انگلی بھی اٹھائی ہے۔

افسانہ

وقت کی تبدیلی و ترقی کے ساتھ ساتھ فکشن میں بھی ترقی ہوئی اور بیسویں صدی کے اوائل میں جب لوگوں کے پاس فرصت کے لمحات اور بھی زیادہ کم ہونے لگے تو افسانے نے جنم لیا۔افسانہ ناول کے مقابلے میں مختصر ترین اور زندگی کے کسی ایک پہلو کو پیش کرتا ہے اور کسی ایک گوشے کو دکھاتا ہے۔افسانے میں شروع سے آخر تک قاری پر ایک وحدت تاثر کو برقرار رکھا جاتا ہے۔اردو میں سب سے پہلے افسانہ نگار کی حیثیت علامہ راشدالخیری کو حاصل ہے۔افسانہ عہد بہ عہد مختلف تبدیلیوں اور فنی و موضوعاتی تجربات سے گزرتا رہا ہے۔ترقی پسند تحریک نے اسے موضوعاتی سطح پر حقیقت نگاری کا ترجمان بنایا۔سعادت حسن منٹو،عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر وغیرہ کے ہاتھوں افسانہ بام عروج تک پہنچا۔پھر تقسیم ہند کے کرب آمیز ہجرت کے مسائل کو قارئین کے سامنے پیش کیا۔ 1960 کے بعد افسانے میں حقیقت پسندی سے قطع نظر کر کے افسانہ نگاروں نے انفرادی مسائل کو علامتی و استعاری انداز میں پیش کیا جسے ادب میں جدیدیت کے نام سے جانا جاتا ہے۔

1980 تک آتے آتے افسانے میں ایک نمایاں تبدیلی یہ آئی کہ اس میں جدیدیت کے تمام فن و موضوعات کو مسترد کیا جانے لگا اور ایک بار پھر افسانہ سماج اور سماجی مسائل کی طرف رجوع ہوا۔اس کے نمائندہ

افسانہ نگار مشرف عالم ذوقی، پیغام افاقی، سلام بن رزاق، بیگ احساس، طارق چھتاری، ساجد رشید، ابن کنول، اور خواتین افسانہ نگاروں میں شائستہ فاخری، صادقہ نواب سحر، رقیہ مشہدی، تبسم فاطمہ اور نسترن احسن فتیحی ہیں۔

افسانہ اور ناول میں سب سے نمایاں فرق یہ ہے کہ ناول ضخیم ہوتا ہے اور افسانہ مختصر۔ اس کی اہم وجہ یہ ہے کہ ناول میں زندگی کے کئی سارے پہلوؤں کو پیش کیا جاتا ہے اور افسانہ میں زندگی کے کسی ایک پہلو کا بیان کیا جاتا ہے۔ افسانہ اور ناول کے فرق کے بارے میں وقار عظیم یوں رقم طراز ہیں:

> ''ناول اور افسانے میں سب سے نمایاں فرق ان دونوں کا طول اور اختصار ہے اور صرف اس فرق کی وجہ سے دونوں میں بہت سی فنی اور لطیف فرق پیدا ہوگئے ہیں۔
>
> جیسا کہ ابھی کہا گیا مختصر افسانے کی سب سے پہلی خصوصیت اس کی وحدتِ تاثر ہے۔ افسانہ شروع کرنے کے بعد اسے ختم کرنے تک اور ختم کر چکنے کے بعد پڑھنے والے کے ذہن پر ایک ہی اثر قائم رہے اور اس سے وہ وہی نتیجہ نکالے جو لکھنے والے نے پہلے سے سوچ بچار کر اپنے افسانے کے لئے مخصوص کر لئے ہیں۔''(45)

آج کے زمانے میں افسانوں کی کوئی کمی نہیں ہے ۔جدھر بھی ہماری نظر جاتی ہے افسانوں کا انبار ہے۔افسانہ پڑھنے والے عموماً دو طرح کے ہوتے ہیں ایک وہ جو علم و ادب کے لیے پڑھتے ہیں اور دوسرے وہ جو تفریح اور دلچسپی کے لیے پڑھتے ہیں۔ جو علم و ادب کے لیے پڑھتے ہیں وہ یہ دیکھتے ہیں کہ افسانہ نگار کون ہے؟ لیکن جو دلچسپی اور تفریح کے لیے پڑھتے ہیں وہ افسانے کی سرخی کو دیکھتے ہیں اگر اسے وہ دلکش لگتا ہے تو وہ اسے پڑھنا شروع کرتے ہیں ورنہ وہ افسانے کو دیکھتے بھی نہیں ہیں۔ اس لیے افسانہ نگار کو اس بات کی طرف بھی توجہ رکھنی پڑتی ہے کہ وہ قاری کو اپنے افسانہ کو پڑھنے کے لیے کس طرح راغب کرے۔ اس ضمن میں وقار عظیم یوں رقم طراز ہیں:

> ''چونکہ سرخی کی حیثیت بالکل اشتہار کی سی ہے اسی لئے کہا جاتا ہے کہ ضروری نہیں کہ وہ افسانے کی روح، اس کے مرکزی خیال یا مقصد کو ظاہر کرے اسے دیکھنے کے بعد یقینی نہیں کہ پڑھنے والا فیصلہ کر سکے کہ جس اشتہار کو دیکھ کر وہ ایک

چیز کی طرف مائل ہوا ہے وہ آگے چل کر اس کی توقعات کے مطابق ہی ہو۔

عموماً افسانے کی سرخی کا معیار اور مقصد یہی رہا ہے کہ وہ پہلی کہ وہ پہلی نظر میں پڑھنے والے کو اپنی طرف مائل اور متوجہ کر سکے لیکن اب وقت کے ساتھ اس روش میں بھی تبدیلی ہوتی جارہی ہے۔ افسانہ نگاروں کو سرخیاں قائم کرنے سے پہلے افسانے کی روح اور اس کے مرکزی خیال پر نظر ڈال لینی چاہئے اور اس کے مجموعی اثر سے متاثر ہونے کے بعد سرخی قائم کرنی چاہئے۔'' (46)

افسانہ نگار اپنی سرخی سے قاری کو اپنی طرف کھینچ تو لیتا ہے۔ اس کے بعد قاری اس افسانے کو پڑھنا شروع کرتا ہے۔ کچھ افسانہ کسی ایسے بیان یا حال سے شروع ہوتا ہے جو قاری کو اپنے ساتھ باندھ کر رکھتا ہے اور آگے چل کر افسانے میں اس حال سے روبرو کراتا ہے۔ قاری کو اس وقت کا انتظار رہتا ہے کہ کب افسانے میں اس حال سے روبرو ہو جس کا جھلک اس نے افسانے کے شروع میں دیکھا تھا۔ اگر اس پیش کردہ حال سے افسانہ نگار قاری کو روبرو نہیں کراپاتا ہے تو قاری کو افسانہ پڑھ کر مایوسی ہوتی ہے۔ کچھ افسانہ دھیرے دھیرے عام انداز میں شروع ہوتے ہیں اور وہ دھیرے دھیرے اپنے قاری کو اپنے گرفت میں لیتے ہیں۔ افسانہ شروع کرنے کا ہر کسی کا اپنا الگ الگ طریقہ ہوتا ہے۔ افسانہ کس طرح شروع ہونا چاہیے اس ضمن میں وقار عظیم یوں رقم طراز ہیں:

''تمہید کے متعلق افسانے کے فنی مبصروں میں ایک بات کہی گئی ہے اور وہ یہ کہ افسانہ نگار کو اپنی مختصر سی تمہید میں کہانی کے خاص کردار اور خاص واقعہ کا مختصر تعارف کر کے الگ ہٹ جانا چاہئے۔ چیخوف اور بیدی کے افسانوں کی تمہیدیں اسی انداز کی ہوتی ہیں۔

بعض اچھے افسانہ نگاروں کے افسانوں کی تمہیدیں دیکھ کر ماہرین فن نے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ کہانی کی تمہید اور کہانی کے نقطۂ عروج میں قریبی تعلق ہونا چاہئے۔ کہانی کا نقطۂ عروج تاثیر کی انتہائی بلندی یا بلندترین نقطہ ہے اور افسانہ نگار کا ہر جملہ آہستہ آہستہ ہمارے خیال اور احساس کو اسی بلندی کی طرف لے جاتا ہے۔ تمہید کو بلندی یا عروج کے اس سفر کا پہلا زینہ ہونا چاہئے کہ تمہید پڑھتے ہی قاری کہانی کی انتہائی دلچسپی کا تصور کر کے اس میں منہمک ہو سکے۔'' (47)

قاری افسانہ پڑھنا شروع کرتا ہے اور وہ افسانے کو پڑھ کر ختم بھی کر دیتا ہے۔ اب آگے کیا؟ کیا وہ اس افسانے کے خیال میں ابھی بھی کھویا ہے یا اس افسانے کو وہ بھول گیا ہے؟ کیا جو تاثر اس نے افسانے کو پڑھتے وقت اپنے اوپر پایا تھا وہ تاثر ابھی بھی ہے یا وہ بھی غائب ہو گیا؟ اس طرح کے کئی سوالات ہیں جس کا جواب ایک کامیاب افسانے کے فہرست میں آنے کے لیے اس افسانہ نگار کو جاننا ضروری ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ افسانہ اس طرح ختم کیا جائے کہ قاری افسانہ کو پورا پڑھ لینے کے بعد بھی اسی میں کھویا رہے۔ اس ضمن میں وقار عظیم یوں رقم طراز ہیں:

> ''افسانے کے خاتمے کی سب سے بڑی خوبی یہی ہونی چاہیئے کہ وہ ہمارے
> دماغ پر وہی اثر قائم رکھے جو افسانے کے شروع سے منتہا تک قائم ہو چکا ہے۔
> افسانے کی روح، اس کی فضا اور اس کا انداز برابر خاتمے تک قائم رہنا ضروری
> ہے ورنہ اس کے اثر میں کمی آجانی لازمی ہے۔'' (48)

افسانے کے فن کو جان لینے کے بعد ہم مصنفہ نسترن احسن فتیحی کے افسانوں کا جائزہ لیتے ہیں۔

منظر نگاری

ناول کی طرح افسانے میں بھی منظر نگاری ایک اہم جز ہے۔ افسانے میں چوں کہ ابتدا سے لے کر افسانہ ختم ہونے تک اسی وحدت تاثر کو برقرار رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ اس لیے افسانہ لکھتے وقت افسانہ نگار کو منظر نگاری کرتے ہوئے اس بات پر اپنا پورا دھیان مرکوز رکھنا ہوتا ہے کہ اس کے منظر کشی سے اس وحدت تاثر پر کوئی فرق نہیں پڑے۔ مصنفہ نسترن احسن فتیحی نے اپنے افسانوں میں منظر کشی بہت ہی باریک بینی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کے افسانوں کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو اس کی نشاندہی ہمیں اکثر جگہ ملتی ہے۔ ان کے افسانوں کو پڑھتے وقت ایسا محسوس نہیں ہوتا ہے کہ اس نے کچھ غیر حقیقی منظر نگاری کی ہے۔ جہاں جہاں بھی کسی منظر کو پیش کیا گیا ہے اسے جب ہم اپنے اطراف میں دیکھتے ہیں تو اسے بالکل ویسا ہی ہے پاتے ہیں۔ مصنفہ کے افسانوں میں منظر حقیقی شے کی طرح قاری کی آنکھوں کے سامنے ابھرتا ہے کیوں کہ مصنفہ کو اپنے موضوع پر دسترس ہے اور اس کی سوچ اور مشاہدہ گہرا ہے۔ منظر نگاری سے متعلق وقار عظیم یوں رقم طراز ہیں:

> ''افسانہ نگار کا پہلا منصب یہ ہے کہ وہ اپنے موضوع سے اچھی طرح واقف

ہو۔ اسے اپنے مضمون اور موضوع سے سچی دلچسپی اور سچا لگاؤ ہو، اسے اس نے
اس کی گہرائیوں میں ڈوب کر دیکھا اور سمجھا ہو۔ اس کے متعلق ہر چھوٹی بات
جاننے کی کوشش کی ہو۔ جب تک یہ سب کچھ نہیں ہوگا افسانہ نگار کو موضوع پر
پوری قدرت نہیں ہوسکتی۔ جسے موضوع پر قدرت نہیں وہ اس موضوع کو پھیلا کر
اچھا افسانہ بنا ہی نہیں سکتا۔ جس نے گھر سے نکل کر مناظر قدرت دیکھے ہی نہیں
وہ منظر نگاری کیا جانے؟ جس نے گوشہ نشینی کو زندگی بنا لیا ہو وہ زندگی کی مصوری
کیسے کرے؟''(49)

جب ہم اہل صبح آفتاب طلوع ہونے سے پہلے نکلتے ہیں تو ہمیں اندھیرا دکھائی دیتا ہے تاریکی کا بول بالا ہوتا ہے، سڑکوں پر لوگوں کا آمد و رفت بھی بہت ہی کم تعداد میں ہوتا ہے کیوں کہ وہ وقت لوگوں کے سونے اور آرام کرنے کا ہوتا ہے۔ ہمارے ملک ہندستان میں دو طرح کی زندگیاں ہیں۔ ایک دیہی زندگی ہے اور دوسری شہری زندگی۔ ایک طرف دیہی زندگی ہے جہاں لوگ صبح آفتاب طلوع ہونے کے بعد اپنی زندگی کے مشاغل میں لگتے ہیں تو دوسری طرف بڑے شہروں کی زندگی میں لوگ آفتاب طلوع ہونے سے پہلے ہی زندگی کے مشاغل میں لگ جاتے ہیں۔ ایسی ہی دو الگ الگ جگہوں کے زندگی کے متعلق منظر کو مصنفہ کے افسانہ ''کشمکش'' میں ذکر آیا ہے جسے مندرجہ ذیل اقتباس میں پیش کیا جا رہا ہے:

''اب صبح کی سرخی نمودار ہو رہی تھی، اور تاریکی کی چادر سمٹی جا رہی تھی، سڑک
بالکل سنسان تھی اور رکشہ مناسب رفتار سے بھاگ رہا تھا۔ میں نے سوچا
۔۔۔قصبے نما اس شہر میں زندگی اب تک سوئی پڑی ہے۔۔۔اور دلّی کی سڑکوں پر
زندگی کب کی جاچکی ہوگی۔۔۔''(50)

ہمارے سماج میں شوہر اور بیوی کا ایک بہت ہی اہم رشتہ ہے اس طرح کا رشتہ مغرب کے سماج میں بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس لیے مشرق کے اس رشتے اور مغرب کے رشتے میں بہت تضاد پایا جاتا ہے۔ چوں کہ مصنفہ ایک ہندستانی عورت ہے اور اس ملک ہندستان میں بیوی اور شوہر کا رشتہ دیگر سبھی رشتوں پر بھاری ہوتا ہے۔ اس رشتے میں دونوں ایک دوسرے سے اس طرح ملے ہوتے ہیں کہ بغیر کسی بات کو کہے بھی وہ ایک دوسرے کی بات کو سمجھ لیتے

ہیں اور ایک دوسرے کی ان کہی خواہشات کو بھی سمجھ لیتے ہیں۔اس کے علاوہ ایک دوسرے کو ہر طرح کی سہولت اور آرام دینے کی بھی کوشش میں اکثر لگے رہتے ہیں۔

خاص کر یہ دیکھا گیا ہے کہ ہمارے سماج میں مرد یعنی کہ شوہر گھر سے باہر کام کرتا ہے۔نوکری کرتا ہے یا کاروبار کرتا ہے اپنی مالی حالت کو خوشگوار کرنے کے لیے جدوجہد کرتا ہے۔اس کے برعکس بیوی گھر کے اندر کا کام کرتی ہے اور گھر کے ماحول کو خوشگوار رکھتی ہے تا کہ جب شوہر باہر سے آئے تو اسے گھر میں سکون کا احساس ہو۔ اپنے شوہر کو باہر ہوئے پریشانیوں کو بھولنے میں اور اس کی تھکاوٹ کو دور کرنے میں بھی مددگار ثابت ہوتی ہے۔ ہمارے سماج میں کم وبیش ہر جگہ یہ دیکھنے کو ملتا ہے کہ جب شوہر باہر سے گھر آتا ہے تو اس کی بیوی اس کے سامنے اس طرح سے پیش آتی ہے کہ اسے دیکھ کر اس کا شوہر باہر ہوئے پریشانی کو بھول جاتا ہے۔گرمی کے موسم میں جب شوہر گھر واپس آتا ہے تو اسے ٹھنڈا پانی دیتی ہے۔اس کو آرام دینے کے لیے گھر کے اندر پنکھا، کولر یا اے سی کو چلاتی ہے تا کہ وہ گرمی سے نجات پا سکے۔ بیوی اس بات کا خیال بھی رکھتی ہے کہ گھر آتے ہی اپنے شوہر سے کوئی سوال نا کرے بلکہ وہ اس وقت یہ چاہتی ہے کہ اس کا شوہر پہلے آرام کر لے اور جب وہ آرام کر چکا ہوتا ہے اور اس کا مزاج خوشگوار ہوتا ہے تو وہ اپنے شوہر سے سوال کرتی ہے ورنہ وہ اپنے سوال کو اپنے من کے اندر ہی رکھ لیتی ہے۔ اسی طرح کے ایک منظر کو مصنفہ نے افسانہ ''ڈائل ٹون'' میں پیش کیا ہے ۔اس افسانے میں گرمی کے موسم میں شوہر باہر سے گھر کے اندر داخل ہوتا بیوی کے دل میں ایک سوال امرتا رہتا ہے مگر شوہر کا مزاج دیکھ کر وہ چپ رہ جاتی ہے اس منظر کو مندرجہ ذیل اقتباس میں پیش کیا جا رہا ہے:

> ''گھر پہنچ کر اس نے ایک لاتعلقی اور سنجیدگی کا انداز اپنایا اور کمرے میں جا کر ایک طرف بیگ پھینکا اور بستر پر دراز ہو گیا۔۔۔ بیوی اس کی آہٹ پا کر لپکتی ہوئی آئی مگر اس کی سنجیدگی دیکھ کر چہرہ کچھ بجھ سا گیا۔اس کی نظروں میں وہی سوال تھا جس سے وہ بچنا چاہتا تھا۔۔۔اس نے آنکھیں بند کر لیں۔۔۔اور بیوی نے بیویانہ سمجھ بوجھ کا پتہ دیتے ہوئے کولر آن کر دیا۔۔۔کولر کی ہوا کا ٹھنڈا اور نم جھونکا دماغ پر چڑھی گرمی کو کم کرنے میں ذرا کارگر ثابت ہوا۔۔۔''(51)

شوہر اور بیوی کا رشتہ مضبوط ہوتا ہے وہ دونوں ایک دوسرے سے جسم اور روح کی طرح جڑے ہوتے ہیں۔

ان دونوں کے درمیان ایک ٹیلی پیتھی چلتی ہے جس میں ایک دوسرے سے بات کیے بغیر بھی دونوں کے بیچ بات ہو جاتی ہے۔اس رشتے کا اثر ایسا ہوتا ہے کہ بغیر ایک دوسرے کو دیکھے بھی ایک ایسا احساس اجاگر ہوتا ہے جس سے پتہ چل جاتا ہے کہ اس کے آس پاس اس کا شوہر یا اس کی بیوی موجود ہے۔ اس رشتے میں خلوص ہوتا ہے پیار ہوتا ہے اور کبھی کبھی ہلکی تکرار بھی ہوتی ہے۔عورت کو اپنے سے زیادہ اپنے شوہر اور اپنے بچوں کا خیال رہتا ہے۔وہ کتنی بھی تھکی ہو، پریشان ہو وہ اپنے شوہر اور بچوں کی ہر چھوٹی سی چھوٹی خواہش کو پورا کرتی ہے۔اس کے شوہر اور بچے جس کام کو خود بھی کر سکتے ہیں، وہ اس کام کے لیے بھی آواز لگاتے ہیں تو وہ خوشی خوشی بنا چہرے پر کوئی شکن لیے ہوئے اس کام کو بھی کر دیتی ہے۔ایسی ہی ایک منظر کا ذکر مصنفہ نے اپنے افسانہ ’’پرچھائیں‘‘ میں پیش کیا ہے جس میں صبا گرمی کے موسم میں لفٹ خراب ہونے کی وجہ سے سیڑھیوں سے چل کل اپنے فلیٹ میں پہنچتی ہےاور اس کے اندر اتنی بھی قوت باقی نہیں رہتی کہ وہ دو قدم چل کر فرج سے پانی لے کر پی سکے۔وہ اپنے بچوں کو آواز لگاتی ہے مگر سبھی اپنے کام میں مشغول رہتے ہیں اور اس کی طرف کوئی دھیان نہیں دیتا ہے۔اس کے برعکس اس کے بچے اسی سے پانی طلب کرتے ہیں اور وہ خوشی خوشی اسے پانی لے کر دیتی ہے۔اس منظر کو مندرجہ ذیل اقتباس میں پیش کیا جارہا ہے:

> ’’ممی ۔۔۔ایک گلاس مجھے بھی۔۔۔سامنے سے بڑی بیٹی پنکی نے آواز لگائی۔وہ گلاس اٹھا کر پنکی کو دے آئی، اس میں اس وقت قوت مدافعت نہ تھی۔ پھر خود پانی پی کر بوتل بھر کر واپس فرج میں رکھا اور ٹی وی روم میں گئی، وہاں راجو اپنے پاپا کے ساتھ ٹوینٹی ٹوینٹی میچ دیکھنے میں محو تھا، ان دونوں کی محویت میں کوئی فرق نہ آیا، اور صبا دو منٹ وہاں پر کھڑی ہو کر لوٹنے لگی پر شوہر اور بیوی ایک دوسرے کی طرف دیکھیں یا نہ دیکھیں ان دونوں کے بیچ ایک ٹیلی پیتھی ہوتی ہے، شاید اسی ٹیلی پیتھی سے اسکے شوہر بلال نے اس کی موجود اور واپسی کو اچانک محسوس کیا اور اس کی دلجوئی کرنے کے لئے جاتی ہوئی صبا سے کہا۔۔۔"صبا دیکھو آج میچ میں بہت مزہ آرہا ہے"۔۔۔‘‘(52)

مصنفہ ڈاکٹر نسترن احسن فتیحی کے افسانوں کی یہ خوبی ہے کہ وہ اپنے افسانوں کی منظر نگاری کرتے وقت ہر چیز کا خیال رکھتی ہیں۔اس کے افسانوں کی منظر نگاری کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں یہ دیکھنے کو ملتا ہے کہ اس کی

منظر نگاری ایسی ہوتی ہے جیسے ہم اس منظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور وہ منظر ہمارے اطراف میں درحقیقی بالکل ویسا ہی ہوتا بھی ہے۔مصنفہ نے افسانہ'' کال بیلیا''میں ایک اونچی جگہ سے دِکھنے والی منظر کو پیش کیا ہے جس میں اس نے نہ صرف درختوں کا ذکر کیا ہے بلکہ شام کے وقت چرند و پرند کے جھرمٹ کا اپنے گھوسلوں کی طرف روانگی کو بھی دکھایا ہے۔اس میں اس نے شام کے وقت کام ختم کر چکے مزدوروں کا اپنے گھروں کی طرف روانگی کے منظر کو بھی پیش کیا ہے۔اس منظر کشی کو مندرجہ ذیل اقتباس میں دیکھا جا سکتا ہے:

''وہ گردن موڑ کر ہوٹل کی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔۔۔وہاں سے پہاڑی کی ڈھلان پر چیڑ کے درختوں کے جھرمٹ میں نیچے دور تک گھاٹی نظر آ رہی تھی اس گھاٹی کے ساتھ کہیں نمایاں اور کہیں غائب ہو جانے والی پگڈنڈیاں سانپ کی مانند بل کھاتی نظر آ رہی تھیں۔اس نے دور افق پر نظر دوڑائی سورج چھپ چکا تھا،آسمان کہیں زرد کہیں پیلا اور افق کے ساتھ سرخی مائل تھا۔دور پہاڑی کے عقب سے جھانکتے ہوئے کیمپ کے آدھے حصے پر اندھیرا اتر آیا تھا اور وہاں کام بند ہو چکا تھا،جنوب کے سمت اڑنے والے جنگلی پرندوں کی قطاروں کے نیچے انسانوں کا ریلا اپنی اپنی منزلوں کی جانب رواں تھا،جن کے ہاتھوں اور کندھوں پر پھاوڑا، بیلچہ اور دوسرے اوزاروں کا بوجھ تھا اور وہ اپنے تھکے ہوئے بیزار قدموں سے اپنے گھروں کی طرف جا رہے تھے۔۔۔''(53)

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہم کسی چیز کو خاص کر اپنی جذبات کو اپنی زبان میں صحیح طریقے سے لوگوں کے سامنے نہیں رکھ پاتے ہیں یا یوں کہیں کہ ہم اپنی جذبات کو بالکل ویسا پیش نہیں کر پاتے ہیں جیسا ہم اپنے اندر محسوس کر رہے ہوتے ہیں۔اس صورت حال میں اس جذبات کو صحیح طور پر بتانے کے لیے اسے ہم کسی ایسے مثال کے ساتھ سمجھاتے ہیں جس سے اس کی وضاحت ہو جاتی ہے اور ہم بہت حد تک اپنے اندر کی جذبات کو سمجھانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔مصنفہ نے اپنے افسانے'' کال بیلیا''میں بھی ایسی ہی ایک جذبات کو پیش کیا ہے جس میں افسانے کا کردار''نرملا جوگن'' جو کہ ایک سپیرن لڑکی ہے اور وہ ٹھا کر سے اپنے ماں، باپ اور بھائی کے موت کا بدلا لینے کے لیے پانچ سال سے تڑپتی رہتی ہے۔اسی تڑپ کو مصنفہ نے جس انداز میں پیش کیا ہے اسے مندرجہ ذیل اقتباس میں

دیکھا جا سکتا ہے:

''مگر حالات ٹھیک نہ ہوئے، کر ما خود آ کر اس سے مل جا تا اور ہر بار اس سے موٹی رقم وصول کرتا جلد شادی کا وعدہ کرتا اور اسے سمجھا تا کہ وہ گاؤں آنے کی غلطی نہ کرے ٹھا کر کو پتہ نہ چلے کہ تو نے اس کے بچے کو جنم دیا ہے ورنہ وہ پورے قبیلے کو ختم کر دے گا۔اور وہ اس کی بات مانتی رہی۔۔۔ ناچتی رہی اور اس کے دل میں الاؤ سلگتے رہے بالکل اس کے گاؤں کے اس ریت کے ٹیلے کی طرح جسمیں کوئلہ بنانے کے لئے لکڑیوں کے ڈھیر سجا کر چاروں طرف سے اسے ریت سے ڈھک دیا جا تا ہے اور اسمیں اندر ہی اندر آگ سلگائی جاتی تھی جس سے ہلکا ہلکا دھواں نکلتا رہتا تھا تین دن بعد آگ بجھ جاتی تو یہ ٹھیلہ کرید کر اندر سے کوئلہ چن لیا جا تا۔۔۔ وہ بھی اسی ٹیلے کی طرح اندر ہی اندر پانچ سال سلگتی رہی ہے۔۔۔''(54)

ہمارے ملک میں ابھی بھی ایسی آبادی ہے جو آج بھی جنگلوں میں رہتی ہے۔انھیں جنگل سے بے انتہا پیار ہے۔وہ جنگل کے ساتھ ساتھ جنگلی جانوروں سے بھی پیار کرتے ہیں۔وہ یہ جانتے ہیں کہ اس جنگلی جانور سے ان کو فائدہ ہی ہے۔اس سے کبھی کبھی نقصان بھی پہنچتا ہے مگر پھر بھی وہ جنگلی جانوروں سے پیار کرتے ہیں۔جنگل میں بنیادی سہولتیں بہت ہی کم ہوتی ہیں پھر بھی وہ اس جنگل سے باہر رہنا پسند نہیں کرتے۔جنگلی جانوروں کی وجہ سے باہر کے لوگ جنگل میں دخل اندازی کم کرتے ہیں مگر کبھی کبھی جب کوئی باہری انسان جنگل میں آ کر کسی جنگلی جانور کا شکار کر دیتا ہے ہیں تو انھیں بہت برا لگتا ہے کیوں کہ اس شکار کی وجہ سے سرکار حرکت میں آ جاتی ہے اور جنگل میں سرکاری افسر اور سپاہیوں کا ہجوم بڑھ جاتا ہے جس کی وجہ سے یہ سیدھے سادھے جنگل میں رہنے والے لوگ شک کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں اور ان کے آمد ورفت پر پابندی لگا دی جاتی ہے۔وہ اب جنگل میں آزادی سے نہیں گھوم سکتے جنگل سے لکڑیاں یا پھل پھول نہیں توڑ سکتے۔جس جنگل کو وہ اپنا گھر مانتے تھے وہ اب ان کے لیے اپنا نہیں رہ جاتا۔جس جنگل کے چپے چپے سے وہ واقف ہوتے تھے ان کے لیے اب انجان کر دیا جاتا ہے۔ایسے ہی ایک جنگل کے منظر کو نیچے آئے اقتباس میں دیکھا جا سکتا ہے۔

''جدنی محتاط قدموں سے آفیسرز کیمپ کی طرف بڑھ رہا تھا۔۔۔سہمی ہوئی نظروں سے وہ چاروں طرف کسی کسی وقت دیکھ لیتا۔ جہاں کے ہرشجروپتّے ، ٹیلے اورمیدان، چرندوپرنداس کے جانے پہچانے تھے۔ جہاں کی ہوااس کی سانسوں کے ساتھ ہم آہنگ تھی، جہاں کے پانیوں کی کل کل اس کا آئینہ تھی۔ وہی علاقہ آج اس کے لئے کتنا اجنبی ہوگیا تھا۔۔۔ بلکہ اجنبی کردیا گیا تھا۔ یہاں سے تاڑ کے پیڑوں کے جھنڈ کے بیچ بنی اس کی جھونپڑی صاف نظر آرہی تھی۔ بائیں طرف ایک ٹیلا اور دائیں طرف کچھ دور تک پھیلا ناہموار میدان۔۔۔کچھ لوگوں کی زندگی کی طرح جس میں کوئی بھی قدم سیدھا نہیں حالانکہ پہرے پر بیٹھے سپاہیوں نے اسے کئی بار دھتکارا تھا۔۔۔ "ادھر بھول سے پیر مت رکھنا۔۔۔ شکاری سمجھ کر گولی چلادی تو دوش دینے کے لئے سے نہیں ملے گا"۔۔۔''(55)

نسترن فتیحی نے جنگل کے منظر کو اپنے افسانہ''نسل'' میں کچھ اس طرح منظرنگاری کی ہے کہ انھوں نے جنگل کے ایک ایک چیز کو قاری کے سامنے رکھ دیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ قاری بھی جنگل کی سیر کررہا ہے۔ منظرنگاری کے ضمن میں اوپر آئے تمام اقتباسات کو دیکھ کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ مصنفہ نے منظرنگاری کرت وقت منظر کو حقیقی شکل دینے کے ہرممکن کوشش کی ہے اور مصنفہ اس میں کامیاب بھی ہوتے دِکھتی ہیں۔

کردارنگاری

ناول کی طرح افسانے میں بھی کردارنگاری ایک اہم جز ہے۔جس طرح افسانے میں منظرنگاری کرتے وقت افسانہ نگار کو افسانے کا وحدت تاثر کو برقرار رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح کردارنگاری کرتے وقت بھی افسانہ نگار کو وحت تاثر کو برقرار رکھنا ہوتا ہے۔ افسانہ نگار اپنے کردار کا تخلیق موضوع کے حساب سے کرتا ہے۔ چوں کہ افسانہ زیادہ بڑا نہیں ہوتا ہے اس لیے افسانہ نگار کو بہت ہی کم الفاظ میں قاری کے سامنے کردار کو اس کی خوبی کے ساتھ پیش کرنا ہوتا ہے۔ افسانے میں کردار اگر اچھے اخلاق کا ہے تو وہ شروع سے لے کر آخر تک اچھا ہی رہے گا اور اگر وہ برے اخلاق کا ہے تو برا ہی رہے گا۔ افسانے کے درمیان اس کے اخلاق میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی کیوں کہ اس سے افسانے کا وحدت تاثر قائم نہیں رہ سکتا۔

نسترن احسن فتیحی کے افسانہ ''کشمکش'' میں ایک کردار رکشے والے کا ہے۔ مصنفہ نے ہمارے اطراف میں پائے جانے والے رکشے والے کی طرح ہی کردار نگاری کی ہے۔ حقیقی زندگی میں بھی جب ہم کسی رکشے والے کو دیکھتے ہیں تو ہمیں وہ گندا کپڑا پہنا ہوا ہی ملتا ہے۔ اس کے جسم پر کبھی کبھی صرف بنیان اور لونگھی دیکھائی دیتا ہے۔ اکثر رکشہ والا اپنے ساتھ گمچھا رکھتا ہے تا کہ جب رکشہ چلاتے وقت پسینہ آئے تو وہ اس گمچھے سے پسینے کو پونچھ سکے۔ مصنفہ نے رکشے والے کو افسانے میں یوں بیان کیا ہے:

''رکشے کے قریب جا کر میں نے ٹارچ کی روشنی میں دیکھا کہ رکشے والا ایک کثیف سا کپڑا منھ پر ڈالے رکشے کی سیٹ پر گہری نیند سو رہا ہے۔۔۔''(56)

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ رکشے والا ایک غریب طبقہ کا انسان ہوتا ہے اور اکثر رکشہ والے کے پاس رہنے کے لیے گھر بھی نہیں ہوتا ہے۔ وہ اپنی نینداور تھکان اپنے رکشے پر ہی سو کر مکمل کرتا ہے اور اپنے جسم کو توانائی دیتا ہے، یہ باتیں کسی سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔ ہم اپنے شہروں اور اپنے اطرف میں رکشے والے کو اسی صورت حال میں پاتے ہیں۔

مصنفہ نے کردار نگاری کرتے وقت کردار کے ماحول اور اس کے لباس کو بھی اپنے ذہن میں رکھا ہے۔ کردار نگاری کرتے وقت کردار کے ماحول اس کی پرورش اس کے اطراف میں رہنے والے لوگ اس کے اثرات کو بھی ذہن میں رکھنا پڑتا ہے۔ جب مصنفہ نے اپنے افسانے میں کسی موسم کا ذکر کیا ہے تو اس موسم کے حساب سے لباس اور دیگر چیز کو بھی اپنے ذہن میں رکھتے ہوئے کردار نگاری کی ہے۔ اس کا ثبوت ہمیں افسانہ ''ڈائل ٹون'' کے مندرجہ ذیل اقتباس سے ملتا ہے:

''وہ ابھی آنے والی اس افتاد کے تناؤ میں ہی تھا کہ اچانک بجلی چلی گئی۔۔۔
کولر کے بند ہوتے ہی یہ آوازیں اور واضح اور قریب محسوس ہونے لگیں۔۔۔اور
ماحول میں پھلی ہوئی گرمی میں حلول ہو کر اس کے دماغ کی نسوں مین نا قابل
برداشت کھنچاؤ ڈالنے لگیں۔۔۔ وہ بلبلا کر کھڑا ہو گیا۔۔۔اور پہلے جوتے اور
موزے اتار کر پھینکے پھر بنیان اور لنگی پہن کر کمرے سے باہر نکلا۔۔۔ بچوں پر
ایک سخت سی نظر ڈالی۔۔۔''(57)

موسم گرما میں انسان ہلکا پھلکا کپڑا پہننا پسند کرتا ہے۔گرمی کے موسم میں انسان یہ چاہتا ہے کہ اس کے جسم کو زیادہ گرمی نا لگے۔اس لیے وہ ہلکے رنگ کا کپڑا پہننا پسند کرتا ہے۔ویسے دیکھا جائے تو انسان موسم گرما میں ہلکے رنگ اور سوتی کپڑا پہننا زیادہ پسند کرتا ہے کیوں کہ یہ جسم کو آرام دیتا ہے اور اگر جسم پر گرمی کی وجہ سے پسینہ آئے تو سوتی کپڑ اپسینے کو جذب کر سکے۔اس کے علاوہ انسان اپنے کام کے مطابق بھی کپڑے کو پہنتا ہے جیسے کہ فیکٹری میں کام کرنے والا مزدور موٹا کپڑا پہنتا ہے مثال کے طور پہ جینس اسی طرح کچن میں جانے سے پہلے عورت سوتی کپڑا پہننا پسند کرتی ہے تا کہ اسے کام کرنے میں سہولت رہے۔ان چیزوں کا بھی خیال مصنفہ نے کردار نگاری کرتے وقت رکھا ہے۔ مصنفہ اپنے افسانے ’پرچھائیں‘‘ میں اسے پیش کیا ہے۔صبا گرمی کے موسم میں باہر سے آتی ہے اور کچن میں جانے سے پہلے اپنی سلک کی ساڑی بدل کر سوتی کی ساڑی پہنتی ہے۔اسے مندرجہ ذیل اقتباس میں دیکھا جا سکتا ہے:

’’وہ وہاں سے آ کر الماری سے اپنے لیے ایک سوتی ساڑی نکالتی ہے۔ممی جلدی کھانا بنا دو مجھے اور پاپا کو بہت بھوک لگی ہے۔صبا کی سماعت سے یہ آواز ٹکرائی۔۔۔اور وہ اپنی سلک کی ساڑی اتار کر سوتی ساڑی باندھ کر باورچی خانے میں چلی گئی۔۔۔‘‘(58)

کردار نگاری کرتے وقت افسانہ نگار کو کردار کے جسم و قامت کا بھی ذکر کرنا ہوتا ہے۔کردار دیکھنے میں کیسا ہے اس کا حلیہ کیسا ہے اس کا رنگ روپ کیسا ہے؟اگر کردار کسی خاص طبقے سے تعلق رکھتا ہے تو اس طبقے کا اثر کردار میں موجود ہونا چاہیے۔مثلاً اگر کردار کسی خاندانی پیسے والے گھرانے سے تعلق رکھتا ہے جیسے ٹھاکر یا راجپوت گھرانے سے تو اس کردار کا قد و قامت لمبا چوڑا ہوگا۔رنگ صاف ستھرا ہوگا۔اس کے کپڑے اور زیورات مہنگے ہونگے۔اسی طرح اگر کردار کسی خانہ بدوش قبیلے سے تعلق رکھتا ہوگا تو اس کا قد و قامت زیادہ لمبا نہیں ہوگا اس کا رنگ و روپ سانولا ہوگا اس کا لباس گندا ہوگا۔یعنی کہ جیسا کردار ہوگا اس کا حلیہ ویسا ہی ہوگا جیسا حقیقت میں ہوتا ہے۔مصنفہ نے اپنے افسانہ’’ کال بیلیا‘‘ میں ایک سپیرن نرملا جوگن کا کردار نگاری کرتے وقت اس کے قد و قامت کا بیان کچھ اس طرح کیا ہے جسے مندرجہ ذیل اقتباس میں دیکھا جا سکتا ہے:

’’وہ اپنے قبیلے کی سب سے خوبصورت عورت تھی،ریگستان کی دھوپ اور ہوا کے اثر سے اس کے ہاتھوں اور چہرے کی جلد بھی دوسرے قبائلی باشندوں کے

> مانند سرخ تھی اور اس کے نقوش بہت پرکشش تھے۔ اپنی ہرنی جیسی خوابناک آنکھوں میں وہ بڑے بڑے رنگین خواب لئے پھرتی، جو سرخ ڈوروں کی شکل میں اس کی آنکھوں میں ہمہ وقت تحریر رہتے۔ سیاہ ریشمی لہنگا چنی کے رنگین نقش و نگار اس خوبصورت سپیرن کے حسن میں ایسا نکھار پیدا کرتے کہ بڑے سے بڑا تکبر اس کے سامنے سرنگوں ہونے کو بے چین ہو جاتا۔۔۔'' (59)

انسان اپنی زندگی میں کئی مراحل سے گزرتا ہے۔ سب سے پہلے وہ بچپن کے دور سے گزرتا ہے جس میں وہ ہر سوچ و فکر سے محفوظ رہتا ہے، پھر وہ بچن کے دور سے گزر کر جوانی کے دور میں داخل ہوتا ہے، جوانی کے اس دور میں اسے زندگی کے ہر پہلو سے سروکار ہوتا ہے۔ اپنی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے جد و جہد کرتا ہے۔ بچپن میں اس کا قد و قامت کچھ اور ہوتا ہے اس کا کردار بھی اس کے بچپن کے مطابق ہوتا ہے۔ جوانی کے دور میں اس کا قد و قامت بڑھتا ہے اس کے کردار میں وقت کے ساتھ تبدیلی آتا ہے۔ جوانی کے دور کے بعد بڑھاپے کا دور آتا ہے اس میں اس کے قد و قامت میں پھر سے تبدیلی آتا ہے۔ اب اس کا جسم پہلے کی طرح قوی نہیں رہتا ہے۔ اس کے بال سفید ہونے لگتے ہیں اس کے جسم کی توانائی کم ہونے لگتی ہے۔ مصنفہ نے اپنے افسانے 'خوشبو' میں ایک بوڑھے انسان دادا ابا کا کردار پیش کیا ہے۔ انھوں نے بہت ہی کم الفاظ میں اس کردار کو بہت ہی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے جس کا اندازہ ہم نیچے لکھے اقتباس سے لگا سکتے ہیں:

> ''اب وہ خود کو بہت اکیلا محسوس کرتی کیونکہ اس گھر میں جس جس کے بے حد قریب تھی وہ سب جا چکے تھے اب اسے سب سے زیادہ جس سے لگاؤ تھا وہ دادا ابّا تھے لیکن ان کے رعب اور دبدبے کے آگے ان کے سامنے نظر اٹھانے کی بھی ہمت اس میں نہیں تھی بس دور دور سے ہی ان کا ہر خیال رکھتی۔ ان کے سفید ریشم سے بالوں والا سر ان کے سفید کمزور پیر اسے اتنے بلند اتنے عظیم لگتے کہ اس کا دل چاہتا کہ وہ ان کے قدموں میں اپنا چہرہ چھپا کر خوب روئے اور کہے دادا ابّا۔۔۔ مجھے اس گھر سے الگ مت کیجئے۔۔۔ مجھے یہیں ایک کونے میں پڑا رہنے دیجئے۔ میں ماں کی طرح پورا گھر سنبھال لوں گی۔ لیکن میری شادی مت کیجئے۔۔۔'' (60)

مصنفہ ڈاکٹر نسترن احسن فتیحی نے اپنے افسانوں میں کرداروں کو ایک حقیقی زندگی دی ہے۔ انھوں نے کرداروں کی کردار نگاری کرتے وقت ہر ایک چھوٹی سی چھوٹی بات کا خیال رکھا ہے۔ انک کے افسانوں کے کرداروں کا اگر ہم حقیقی زندگی سے موازنہ کریں تو ہمیں ایسا لگتا ہے کہ یہ کردار افسانوں میں ہی نہیں ملتے ہیں بلکہ ہمارے حقیقی زندگی کے کردار ہیں۔ان کے افسانوں کے کرداروں کا مطالعہ کرنے کے بعد قاری کے دل میں کردار کو لے کر کسی طرح کی کوئی شک وشبہ نہیں رہتا ہے۔

مکالمہ نگاری

افسانہ نگار کو افسانہ لکھتے وقت اس کے زبان وبیان پر بھی اپنا دھیان مرکوز رکھنا ہوتا ہے۔افسانے میں کردار کے ماحول اس کی خوبی اور حالات کو دیکھتے ہوئے مکالمہ کرایا جاتا ہے۔افسانے میں کسی چیز کا بیان کرتے وقت بھی افسانہ نگار کو اچھے انداز کا اپنا پڑتا ہے۔افسانوں میں مکالمہ کے بارے میں وقار عظیم یوں رقم طراز ہیں:

> ''مکالمے کے لئے بھی دوسری چیزوں کی طرح ضروری ہے کہ وہ حقیقی معلوم ہو۔افسانہ نگار دو کرداروں میں مکالمہ کروائے تو وہ بالکل ویسا ہی ہونا چاہئے جیسا کہ اصل زندگی میں۔ اسے کم از کم ایسا ضرور ہونا چاہئے کہ پڑھنے کے بعد پڑھنے والا اسے غیر ممکن نہ سمجھے۔ اس کے ایک ایک لفض میں حقیقت اور اصلیت کی بو آتی ہو۔
>
> مکالمے میں حقیقت اور اصلیت اس وقت تک نہیں پیدا ہو سکتی جب تک اس کے لفظ لفظ سے اس بات کا پتہ نہ چلے کہ اس کا کہنے والا کون ہے۔افسانوی گفتگو کو اپنے کردار کی فطرت کے بالکل مطابق ہونا چاہئے تاکہ اس کے منھ سے نکلے ہوئے لفظ اس کی زبان سے اجنبی معلوم نہ ہوں۔''(61)

ان باتوں کو ذہن میں رکھ کر مصنفہ ڈاکٹر نسترن احسن فتیحی کے افسانوں کے مکالمہ نگاری کا جب مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں ان کے مکالموں میں کسی طرح کی کمی کا احساس نہیں ہوتا ہے۔مصنفہ کے افسانہ ''کشمکش'' میں ایک مکالمہ پیش آیا ہے جس میں ایک انسان صبح صادق سے پہلے اپنے گھر سے نکلتا ہے اور اسے بس لے کر دہلی جانا ہے۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ اس کے پاس وقت بہت کم ہے اور بس اسٹینڈ جانے کے لیے صرف ایک رکشہ موجود ہے اور وہ رکشہ

والا بھی بس اسٹینڈ جانے سے منع کرتا ہے تو وہ کس طرح سے اسے راضی کرتا ہے اس مکالمے کو مندرجہ ذیل اقتباس میں پیش کیا جا رہا ہے:

''"ارے بھئی۔۔۔اٹھو۔۔۔بس اسٹینڈ چلنا ہے۔" میری آواز سناٹے میں سر دھنتی رہ گئی۔۔ میں نے اس بار رکشے والے کے کاندھے کو ہلکے سے چھوا۔۔

"اٹھو۔۔۔۔۔بس اسٹینڈ جانا ہے۔"

"مجھے نہیں جانا ہے صاحب۔۔۔ دوسرا رکشہ دیکھیں۔" اس نے جھنجھلائے ہوئے انداز میں جواب دیا مگر مجھے برا نہیں لگا، آخر میں اس کی گہری نیند میں مخل ہوا تھا۔ مگر میرا اضطرار بڑھ رہا تھا، میں کسی بھی طرح یہ بس چھوڑ نا نہیں چاہتا تھا۔

"چلو بھئی ۔۔۔ یہاں کوئی دوسرا رکشہ نہیں ہے۔" اس بار ذرا زور سے جھنجھوڑتے ہوئے میں نے کہا، میری آواز میں بے چارگی عود کر آئی تھی، مگر وہ راضی نہیں ہوا۔

"طبیعت ٹھیک نہیں ہے صاحب۔۔۔ مجھے نہیں جانا ہے۔" اس بار اس نے چہرے سے کپڑا ہٹا کر کندھے پر رکھا اور اٹھ کر بیٹھتا ہو بولا۔''(62)

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مصنفہ نے مکالمہ نگاری میں مکالمے کو طول نہیں دیا ہے۔ جتنے کی ضرورت تھی اتنی ہی کی ہے، اس کے ساتھ ساتھ مکالمہ کراتے وقت الفاظ بھی کردار کے مطابق ادا کرایا ہے۔ اس مکالمے کو جب ہم غور سے دیکھتے ہیں تو ہم یہ پاتے ہیں کے یہ مکالمے بالکل ویسا ہی ہے جو حقیقی زندگی میں ایک انسان اور ایک رکشہ والے کے درمیان ہوتی ہے۔

ایک گھر میں کئی افراد رہتے ہیں۔ان لوگوں کے درمیان ہونے والی بات چیت اور مکالمہ الگ الگ قسم کے ہوتے ہیں۔اس گھر میں ایسا نہیں ہے کہ صرف بیوی ہی اپنے شوہر کا خیال رکھتی ہے بلکہ شوہر بھی اپنی بیوی کا خیال رکھتا ہے۔اس کے علاوہ شوہر اپنے ماں باپ اور اپنے بچوں کا بھی خیال رکھتا ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ جب انسان کسی کام کو کرانے کے لیے جد وجہد کرتا ہے اور وہ اس کام میں نا کام ہوتا ہے تو اس کے اندر غصہ اور جھنجھلاہٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ جسے وہ اپنے اوپر حاوی ہونے سے بچاتا رہتا ہے۔ کبھی وہ اس میں کامیاب ہو جاتا ہے اور کبھی اس کا غصہ

اس کے اوپر حاوی ہو جاتا ہے۔تھوڑی وقت گزر جانے کے بعد انسان جس مسئلے سے دو چار ہو رہا ہوتا ہے اوراس سے گھر کے دوسرے افراد واقف ہونا چاہتے ہیں تو وہ خود ہی موقع دیکھ کر اپنی حالت ان لوگوں کے سامنے رکھتا ہے۔اس ماحول میں لوگ ایک دوسرے کی پریشانی کو سمجھتے ہیں اور زیادہ سوال نہیں کرتے ، جتنے کی ضرورت ہوتی ہے اتنی ہی بات کرتے ہیں۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ بچے جزبات میں آ کر کچھ زیادہ بول جاتے ہیں وہ اپنے مسئلے کا حل دوسرے لوگوں کے مسئلے کے ساتھ جوڑنے لگتے ہیں۔کیوں کہ بچوں کا سوچ اتنا وسیع نہیں ہوتا ہے کہ وہ اس ممسئلے کے دوسرے پہلو کو بھی ذہن میں رکھ کر بولیں۔ایسا ہی ایک مکالمہ مصنفہ نے اپنے افسانہ ''ڈائل ٹون'' میں پیش کیا ہے جس میں ایک گھر کے افراد ٹیلی فون لگنے کا انتظار کر رہے ہوتے ہیں اور انھیں ایسا لگتا ہے ان کے ٹیلی فون میں نہ جانے کب ڈائل ٹون آئے گا اور وہ دوسرے لوگوں کے مانند اپنے ٹیلی فون کا استعمال کر سکیں گے۔ان کے بچے چوں کہ پراوٗٹ اسکول میں پڑھتے ہیں اور ایک سوسائٹی میں رہتے ہیں جس میں بچے آپس میں بات چیت کرتے وقت اکثر انگریزی الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔اس کا اثر اس مکالمے میں دیکھنے کو ملتا ہے۔اس مکالمے کو مندرجہ ذیل اقتباس میں پیش کیا جا رہا ہے:

''"چار بج گئے ہیں۔۔۔آ کر کھانا کھالو۔۔۔" بیوی کی آواز میں بلاوا کم اور دھمکی زیادہ تھی۔۔۔

وہ اٹھا اور ڈائینگ ٹیبل پر آ کر بیٹھ گیا۔۔۔ایک ایک کرسی کھسکا کر اس کی بیوی اور بیٹی بھی بیٹھ گئیں ۔۔۔کھانا کھاتے ہوئے اسے لگا کہ آج کی ساری روداد سنا کر شاید اس کے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہو جائے۔۔۔ اور سب کا تناوٗ بھی۔۔۔

"میں گیا تھا ٹیلی فون ڈیپارٹمنٹ۔۔۔مگر وہ آدمی تھا نہیں۔۔۔دو گھنٹے بیٹھا رہا تب جا کر آیا۔۔۔"

" کیا کہا اس نے۔۔۔" بیٹی نے بڑی بے چینی سے پوچھا۔

" آج ایک نیا بہانہ۔۔۔پرسوں بلایا ہے۔۔"

"اُف کتنی کمیونیکیشن پروبلم ہم لوگ فیس (FACE) کر رہے ہیں۔۔۔

پاپا۔۔۔میری کئی سہیلیوں کے یہاں تو انٹرنٹ کی سہولت بھی اب ہے۔کئی کے
پاس موبائل فون ہے۔۔۔اور ایک ہم ہیں کہ معمولی سا فون اتنی بھاگ دوڑ کے
بعد ملا بھی تو نہ اب تک نمبر ملا ہے نہ ہی ڈائل ٹون۔"

"اوپر ساہنی صاحب کا فون بھی لگ گیا ہے۔۔۔"بیوی نے اطلاع دی تو اسے
یاد آیا اس نے اور ساہنی نے ایک ساتھ ہی فون کے لئے اپلائی کیا تھا۔۔۔''(63)

ایک پڑھے لکھے انسان اور ایک جاہل انسان کے درمیان جو مکالمے ہوتے ہیں دونوں بالکل مختلف ہوتے ہیں۔جاہل انسان آپس میں کسی بات کو صحیح طریقے سے نہیں رکھ پاتا ہے اور کسی بات کو سمجھانے میں اسے بہت وقت لگتا ہے اور اس کا مکالمہ لمبا ہو جاتا ہے۔جبکہ پڑھے لکھے انسان کے بیچ جو بات چیت ہوتی ہے اس میں زبان و بیان پر بہت زیادہ دھیان رہتا ہے۔ لوگ آپس میں بات کرتے وقت ایسے الفاظ کا استعمال کرتے ہیں جس کا مفہوم اچھا ہو یعنی کہ اس لفظ کا معنی بالکل صاف ہو جس کو سمجھنے میں سننے والے کو مشکلوں کا سامنا نہ کرنا پڑے اور سننے میں اچھا بھی لگے۔ان کے درمیان ہونے والے مکالمے کی ایک خاصیت یہ بھی ہوتی ہے کہ ان کے مکالمے بہت لمبے نہیں ہوتے ہیں۔جب ایک دوست دوسرے دوست کے ساتھ بات کرتا ہے تو اس کا مکالمہ الگ ہوتا ہے۔ایسی ہی خوبیوں سے بھرا مصنفہ نے ایک مکالمہ اپنے افسانہ ''سادہ اوراق'' میں پیش کیا ہے جس میں ایک لڑکا احمد جو ایک اخبار کی کمپنی میں انٹرویو دے کر آتا ہے اور اس کمپنی میں اس کا دوست پہلے سے کام کر رہا ہوتا ہے۔اسی دوست کا فون آنے پر دونوں کے درمیان کچھ مکالمے ہوتے ہیں۔اس مکالمے کو افسانہ نگار ڈاکٹر نسترن احسن فتیحی نے جس کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے اسے مندرجہ ذیل اقتباس میں دیکھا جا سکتا ہے:

''"ہیلو۔۔۔"

"یار وہ تو نے انٹرویو میں یہ کیا کہہ دیا کہ تو سچائی سے کوئی سمجھوتہ نہیں۔"

"میں نے وہی کہا جو میں سوچتا ہوں۔"

"پاگل ہے یار۔۔۔کچھ لچک پیدا کر۔۔۔ ہمارے پروفیشن میں اتنی اکڑ
اچھی نہیں۔تیرے ٹیلنٹ سے متاثر ہیں مگر تیرے خیالات سے مطمئن نہیں، تجھے

تو ان کے حساب سے ہی کام کرنا ہوگا۔"

"تو یہ بتا۔۔۔مجھے ریجکٹ کر دیا۔۔؟"

" نہیں یار۔۔۔ابھی کیا تو نہیں۔۔۔تجھے سمجھانے کو کہا ہے، اتنی آگ اچھی نہیں اس آنچ کو تھوڑا دھیما کر۔۔۔اچھی نوکری ہے، اچھے پیسے ہیں۔۔۔ان کے حساب سے کام کرنا اتنا مشکل نہیں ایک بار آ کر تو دیکھ۔ساتھ میں رہنے کے لئے فلیٹ بھی ملے گا، اتنی سہولت اور ایسا مشاہرہ تجھے کہیں نہیں ملے گا۔۔۔"

"ہووووووں۔۔۔"اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔۔۔''(64)

غریب انسان کے پاس اتنا پیسا بھی نہیں ہوتا کہ وہ دو وقت کی روٹی صحیح سے کھا سکے۔ایسی صورت حال میں وہ اپنے بچے کو کیسے پڑھا لکھا سکتا ہے۔جب انسان پڑھا لکھا نہیں ہوگا اور وہ بچپن سے ہی دوسرے کے یہاں کام کر اپنا اور اپنے گھر کے لوگوں کا پیٹ بھرتا ہے۔ایسے لوگوں کا مکالمہ اور بات چیت بھی ایک جاہل انسان کی طرح ہوتا ہے۔اس کے مکالمے میں ایک دوسرے کے لیے احترام اور عزت کی کمی ہمیں صاف دیکھنے کو مل جاتی ہے۔کبھی کبھی ایسے حالات میں پلے بڑھے لوگ بھی اچھے طور طریقے ان لوگوں سے سیکھ لیتے ہیں جنکے یہاں یہ کام کرتے ہیں۔مصنفہ نے ایک ایسی ہی غریب اور جاہل لڑکی للیا اور اس کی ماں جمنی کے درمیان ہوئے مکالمہ کو بہت ہی خوبصورتی کی ساتھ افسانہ ''خوشبو'' میں پیش کیا ہے۔اس میں ایک بیمار ماں اپنی بیٹی للیا سے کام پر جانے کو کہتی ہے اور اس کی بیٹی اس سے غصے میں بات کرتی ہے۔اس افسانے کا وہ اقتباس جس میں ان دونوں کے درمیان مکالمۂ پیش آیا ہے اسے مندرجہ ذیل اقتباس میں دیکھا جا سکتا ہے:

''"ہاں تجھے بھوک کیوں لگے گی۔تجھے پوریاں ملیں تبھی کھائے گی۔"للیا کی بات سن کر جمنی چپ رہی تو للیا نے کہا۔۔۔"میں جا رہی ہوں۔اب سانجھ کو ہی لوٹوں گی تیری روٹی لے کر"۔۔۔"اری سن"۔۔۔جاتی ہوئی للیا کو اس نے جلدی سے پکارا۔۔۔"تو بہن جی سے کہنا تھوڑا آٹا ہی دے دیں۔روٹی مت لینا۔گھر میں سانجھ کو چولھا جلتا ہے تو بہت اچھا لگتا ہے۔"

ماں کی بات سن کر للیا کا پارہ پھر ساتویں آسمان پر چڑھ گیا۔۔۔"بس تجھے ہری ہری سوجھنے لگی۔۔۔ایک تو میں سارا دن ادھر ادھر مر کر آؤں۔پھر یہاں

تیرے لئے گرم گرم روٹی پکاؤں دم نکلنے کو ہے اور شوقینی میں کمی نہیں آئی۔" للیا بڑ بڑاتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔''(65)

افسانہ نگار نسترن احسن فتیحی نے اپنے افسانوں میں جو بھی مکالمے پیش کئے ہیں وہ کردار اور اس کے ماحول کے مطابق پیش کئے ہیں۔ ان کے مکالمے ان کے افسانوں کو آگے کی طرف لے کر جانے میں بہت اہم رول ادا کرتے ہیں۔ اس میں انہوں نے انگریزی زبان کا بھی استعمال کیا ہے، اس میں انہوں نے جنگلی زبان کا بھی استعمال کیا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے جاہل لوگ جس طرح کی زبان استعمال کرتے ہیں اسے بھی کردار اور ماحول کے مطابق استعمال کیا ہے۔ اس سب کے علاوہ ان کے افسانوں کا جب ہم جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں اس بات کا بھی ثبوت ملتا ہے کہ انہوں نے اپنے افسانے میں ہندستان میں رائج محاوروں کا استعمال کیا ہے جو ان کے افسانے کو ایک نیا رنگ روپ عطا کرتا ہے۔ مصنفہ کے افسانے ''ڈائل ٹون'' میں استعمال کیے گئے محاورے کو مندرجہ ذیل اقتباس میں پیش کیا جا رہا ہے:

''پھر وہ بیوی سے مخاطب ہوا۔۔۔

"لائیٹ آتے ہی کھانا نکالو۔۔۔ اس گرمی میں کھانا کیسے کھایا جا سکتا ہے۔ وہ بدبداتا۔۔۔ جھلاّتا بلا ارادہ ڈرائینگ روم کی طرف بڑھ گیا۔۔۔ اس کی جھلاّہٹ سے بظاہر ہر طرف سانپ سونگھ گیا تھا مگر جھلاّہٹ بھرے وہ الفاظ سب کی سماعت سے ہوتے ہوئے سب کی وجود میں حلول کر گئے تھے۔۔۔ اور اب ہر چہرہ تناؤ میں نظر آ رہا تھا۔

بجلی تو سسرال سے روٹھی ہوئی بہو کی طرح غائب تھی۔۔۔ جسے نہ آنا تھا نہ آئی۔۔۔ اور سب کی تناؤ میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔۔۔ بیوی نے اپنی جھنجھلاہٹ بچوں پر نکالی اور انہیں ڈانٹ پھٹکار کر کھانا کھلا دیا۔۔۔ دونوں بیٹے اب بنیان اور نیکر پہنے بوکھلا بوکھلا کر بات بات پر ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو رہے تھے۔۔۔

ان کی بنیان جیسے پسینے سے نہیں بلکہ شرم سے پانی پانی ہو رہی تھی ۔۔۔ اور کیوں نہ ہوتی بھائیوں کے بیچ کی محبت جو آج کل کے بجلی اور پانی کی طرح ناپید ہو گئی تھی۔۔۔''(66)

مصنفہ ڈاکٹرنسترن احسن فتیحی نے اپنے افسانوں میں کرداروں سے مکالمہ نگاری کراتے وقت بھی بہت ہی احتیات سے کام لیا ہے۔ان کے کردار اپنے مکالمے سے اپنے کردار کو اچھی طرح قاری کے سامنے پیش کرنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے ۔مصنفہ نے کرداروں سے مکالمہ نگاری کراتے وقت کردار کی خوبی اس کے ماحول اس کے اطراف کا بہت خیال رکھا ہے۔مکالمے کو بہت طویل نہیں کیا ہے۔ان کے افسانوں کے مکالموں میں حقیقی پہلونظر آتے ہیں۔

موضوع

افسانوں کے لیے اس دنیا میں موضوع کی کوئی کمی نہیں ہے۔اللہ کے بنائے اس کائنات کے ہر کونے کونے میں لاتعداد موضوع ہیں۔پیڑ،پودے،جنگل،پہاڑ،چاند،سورج،ندی،سمندر،تتلی،ہرن،پھل،پھول اور نہ جانے کیا کیا؟یہ سبھی افسانوں کے لیے موضوع ہیں مگر اس کے لیے موضوع کو تلاش کرنے والی نظر اور سوچنے والا دماغ کی ضرورت ہے۔موضوع کی تلاش کے بارے میں وقار عظیم یوں رقم طراز ہیں:

> ''جس نے اپنی نظر کو کائنات کی رنگینیوں کے لئے وقف کر دیا ہے،جس کا دل ہر وقت کسی نئے جذبے سے معمور نظر آتا ہے اور جس کے ذہن میں ہر وقت دیکھی اور محسوس کی ہوئی باتوں کو جگہ دینے اور ان پر غور وفکر کرنے کی گنجائش ہے، اسے افسانے کے موضوع ہر وقت سوجھتے ہیں۔وہ بن بلائے مہمانوں کی طرح ہر وقت اس کے دروازے پر دستک دیتے ہیں۔افسانہ نگار کی نظر کے سامنے کوئی چیز آتی ہے اور یہ چیز جیسے خود بخود ذہن میں ایک نیا موضوع لا کر کھڑا کر دیتی ہے۔اس کے فکری،تخیلی اور جذباتی سرمائے میں گھل مل کر یہ موضوع یا مرکزی خیال ایک افسانے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔'' (67)

انسان کبھی کبھی ایسے حالات سے گزرتا ہے جس میں وہ ہر طرح سے قابل اور قدرت رکھنے کے باوجود اپنے آپ کو لاچار اور بے بس پاتا ہے۔کیوں کے وہ کسی اور کی مدد کے بغیر اس کام کو نہیں کر سکتا۔اس صورت حال میں وہ یہ چاہتا ہے جس کی مدد سے وہ اس حالت سے باہر نکل سکتا ہے اسے کسی طرح اپنی مدد کے لیے راضی کرے۔کبھی کبھی انسان زبردستی سے کام لیتا ہے تو کبھی انسان پیار محبت سے کام لیتا ہے۔کبھی انسان مدد کرنے والے کے سامنے

لجاجت بھرے انداز میں بات کرتا ہے اور کبھی کبھی سامنے والے کی کسی ایسی ضرورت کا پتا ہونے پر اس کی ضرورت کو پورا کرنے میں مدد کا لالچ دے کر وہ اس حالت سے باہر نکلنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ اسی طرح کے موضوع کو پیش کرتا ہے افسانہ ''کشمکش''۔ اسے مندرجہ ذیل اقتباس میں دیکھا جا سکتا ہے:

''" کہا نہ صاحب طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" وہ بھی ایک ضدّی تھا، مجھے غصہ آنے لگا مگر ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"ارے تم زیادہ پیسے لے لینا۔۔۔ میرا جانا بہت ضروری ہے، بس تم یہ بس پکڑوا دو، بڑی مہربانی ہوگی۔"

میرے لجاجت بھرے انداز کا اثر تھا یا پیسے کی بات کا وہ رکشے سے اتر آیا۔ اور میں ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اچک کر رکشے پر بیٹھ گیا۔۔۔''(68)

آج کے زمانے میں انسان کو پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے؟ اسے کیا چاہیے؟ اسے خود ہی نہیں معلوم۔ اس کے چاروں طرف اس کے آس پاس دوست احباب، رشتہ دار، گھر پریوار کے لوگ سبھی موجود ہیں جن سے بات کر کے جن کے ساتھ وقت گزار کر دل کو خوشی مل سکتی ہے۔ مگر وہ ان سب کے ساتھ وقت گزارنے اور ان کے ساتھ خوشی حاصل کرنے کے بجائے بے جان دنیا کے بے جان چیزوں کی طرف دوڑتے ہیں مثلاً فلمی میگزین، انٹرنیٹ وغیرہ۔ اس سے لوگ اپنے دل کی خوشی تلاش کرتے ہیں۔ جبکہ یہ بے جان چیزیں جس میں خود کوئی جان نہیں وہ کسی کو خوشی کیا دے سکتی ہے۔ اس بے جان دنیا کی طرف بھاگ رہے لوگوں کو موضوع بنا کر مصنفہ نے اپنے افسانہ ''ڈائل ٹون'' میں ذکر کیا ہے جسے مندرجہ ذیل اقتباس میں پیش کیا جا رہا ہے:

''بڑی بیٹی البتہ ایک ہاتھ میں کھجوار کا پنکھا لئے زور۔ زور سے ہلا رہی تھی اور دوسرے ہاتھ سے فلمی میگزین کی ورق گردانی کر رہی تھی۔۔۔ جب آس پاس آسودگی اور آسائش کے چہروں پر خراشیں پڑنے لگیں تو ایسے موقعے پر نئی نسل خوبصورت میگزین کی مردہ تصویروں کے روشن اور تابناک چہروں سے زندگی کی حرارت اور خوشی تلاش کرتی نظر آتی ہے۔۔۔''(69)

انسان کو اس دنیا میں کبھی کبھی کسی کام کو پورا کرانے کے لیے کئی دور سے گزرنا پڑتا ہے۔ خاص کر جب وہ کام

کسی سرکاری دفتر کا ہو۔سرکاری دفتر میں تو آج کل کوئی بھی کام بغیر رشوت کے ہوتے ہی نہیں۔رشوت بھی بھرپور چاہیے ہر کام کے لیے مارکیٹ میں ریٹ کھلا ہوا ہے اگر آپ نے اس سے کم پیسے دیے تو آپ کا کام ہونے میں بہت زیادہ وقت لگ جائے گا۔ اور جس انسان نے ایک بھی روپے خرچ نہیں کیا ہو اس کے کام میں تاخیر کا کوئی اندازہ بھی نہیں لگا سکتا کہ کتنا وقت لگے۔وہ انسان جس نے رشوت نہیں دیا ہو اور وہ اس کام کو پورا کرانے کے لیے اکثر سرکاری دفتر کا چکر کاٹتا ہو۔اس انسان کو کبھی کبھی لگتا ہے کہ اس کی محنت اور مشقت کی وجہ سے اس کا کام ہو جائے گا۔ بھلے ہی اس میں بہت تاخیر ہو جائے۔اس کے پیچھے وہ اپنا بیش قیمتی وقت صرف کرتا ہے، کئی کئی گھنٹے تک دفتر میں انتظار کرتا ہے۔اسے کام پورا ہو جانے پر بہت خوشی ہوتی ہے لیکن جب اسے یہ بات پتہ چلتی ہے کہ اس کی محنت کی وجہ سے نہیں بلکہ گھر کے کسی افراد نے اس کام کو رشوت دے کر پورا کرایا ہے تو وہ اپنے آپ کو بے حد لاچار، کمزور اور ہارا ہوا پاتا ہے۔مصنفہ نے افسانہ ''ڈائل ٹون'' میں اسی موضوع کو دِکھایا ہے جسے مندرجہ ذیل اقتباس میں پیش کیا جا رہا ہے:

''ابھی وہ باتھ روم سے نکل کر تولیہ سے اپنے گیلے بالوں کو خشک کرنے کے بعد آئینے کے سامنے کھڑا ہی ہوا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔۔۔اس کے ہونٹوں پر ایک آسودہ سی اطمینان بخش مسکراہٹ ابھر آئی۔۔۔آخر کار وہ جیت گیا۔۔۔اور بغیر رشوت کے اپنی کوششوں میں اسے کامیابی ملی تھی۔۔۔ بیوی بچے سب فون کی طرف لپک چکے تھے۔۔۔ وہ اطمینان سے اپنے بالوں میں کنگھی کرتا رہا۔۔۔گھر میں آئی خوشی کی یہ لہر اسے عجیب سا سکون دے رہی تھی۔۔۔ بیٹی نے فون اٹھا کر اپنا نمبر نوٹ کیا۔تبھی بیوی نے رسیور اس کے ہاتھوں سے لیتے ہوئے بات شروع کی۔۔۔

" تھینک یو۔۔۔ بھائی صاحب، مہربانی آپ کی۔۔۔آگے بھی خیال رکھئے گا کبھی فون خراب ہو تو۔۔۔آپ کو مل گیا تھا نا۔۔۔؟ پہلے بتا دینا چاہئے تھا۔۔۔ خواہ مخواہ اتنا انتظار کرنا پڑا۔۔۔ میں نے ساہنی صاحب سے آپ کا تحفہ بھیجا تھا۔۔۔ٹھیک۔۔۔ہنسی۔۔۔ہاں۔۔۔ہاں۔۔۔کیوں نہیں۔۔۔ہم بھی ہمیشہ آپ کا خیال رکھیں گے۔۔۔او کے۔تھینک یو۔۔۔"

اب اس کی بیوی نے رسیور واپس کریڈل پر رکھ دیا تھا۔۔۔اور وہ سُن سا کھڑا

تھا۔۔۔ وہ ہار گیا تھا۔۔۔ یہ باتیں تیزاب کا تاثر رکھتی تھیں۔۔۔ جو اس کے
یقین، اس کے اعتماد۔۔۔ اور اس کے اندر کے سچے انسان کو جھلسا گئی تھیں۔۔۔
اس نے آئینے میں دیکھا تو اسے لگا جیسے اس کا چہرہ مسخ ہو گیا تھا اور وہ سوچ رہا تھا
کہ یہ مسخ شدہ چہرہ اس کا ہے یا ایک سیدھے اور سچے انسان کا۔۔؟'' (70)

انسان کبھی کبھی اپنی زندگی کو آرام اور آسائش سے بھرنے کے لیے نہ جانے کن کن چیزوں کی قربانی دیتا ہے۔ اور اس کی قیمت کا اندازہ اسے اس وقت تک نہیں ہوتا ہے۔ جب تک وہ ان آسائشوں کو پانے کے لیے دی گئی قربانی کا موازنہ اس سے نہیں کرتا ہے۔ انسان کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ جس جگہ سے تعلق رکھتا ہے جہاں اس کا بچپن گزرا ہو جہاں کھیل کود کر وہ بڑا ہوا ہو۔ وہ چاہے جنگلی جگہ ہو، پہاڑی جگہ ہو، دیہاتی جگہ یا پھر وہ کتنی بھی بنیادی سہولتوں سے محروم کیوں نہ ہو اسے بہت پسند ہوتا ہے۔ اسے اس سے جڑے رہنا اچھا لگتا ہے۔ اس تہذیب اور کشش کے موضوع کو بھی مصنفہ ڈاکٹر نسترن احسن فتیحی نے اپنے افسانہ کال بیلیا میں کچھ اس طرح پیش کیا ہے:

''وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر کھڑکی سے ہٹ آئی اور اپنے نرم بستر پر
لیٹ کر سوچنے لگی۔ اس کی زندگی میں یہ آسائشیں جن چیزوں کو کھو کر آئی ہیں
وہ ایسی تو نہ تھیں کہ پیچھے مڑ کر دیکھا جائے مگر اپنا قبیلہ اپنے لوگ کتنے بھی
قدامت پرست ہوں، وہ علاقہ کتنا بھی بنیادی ضرورتوں سے محروم ہو، اپنی
تہذیب کی جڑوں سے جڑ کر جینا اور مرنا انسان کی سب سے پہلی بنیادی
ضرورت ہے۔'' (71)

اس بے روزگار اور بے اصول دنیا میں کبھی کبھی انسان ہر طرح سے قابل ہونے کے باوجود صرف اس کے اصول پسند ہونے کی وجہ سے بھی نوکری نہیں ملتی ہے۔ اس دنیا میں کچھ لوگ بے روزگار رہنے سے اچھا اپنے اصولوں سے سمجھوتا کرنا سمجھتے ہیں۔ کچھ لوگ اپنے اصول کے پابند ہوتے ہیں اور وہ بے روزگار رہنا زیادہ پسند کرتے ہیں اس کے مقابل کے وہ اپنے اصول سے سمجھوتا کرے۔ آج کی اس دنیا میں کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان بے روزگاری اور غریبی کے سبب اپنے خود کے کام کو کسی دوسرے کو بیچ دیتا ہے اور خریدنے والا شخص اسے اپنے نام سے دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ کچھ عمدہ کلام، مضمون، اور کتاب لکھنے والے مصنف بھی ایسا کام کراتے ہیں کیوں کہ ان کے

پاس اتنا وقت نہیں ہوتا ہے کہ وہ خود ایک ساتھ کئی کام کریں اس لیے وہ اس طرح کے لوگوں کی تلاش میں رہتے ہیں جو روپے لے کر لکھتے ہیں۔اس طرح روپے لے کر لکھنے والے کو گھوسٹ رائیٹر کہتے ہیں۔اس بھاگ دور کی دنیا میں اس طرح کے گھوسٹ رائیٹر عموماً تخلیقی اور تنقیدی دونوں طرح کے کام کرتے ہیں کسی کتاب کا ریویو لکھتے ہیں جسے کسی بڑے نقاد کے نام سے شائع کروایا جاتا ہے جس سے نئے لکھنے والے کا نام ہو سکے یا پھر کسی مشہور مصنف کو کسی اعجاز اور اوارڈ کو حاصل کرنے میں اس سے مدد مل سکے۔ایسی ہی گھوسٹ رائیٹر کے موضوع کو مصنفہ ڈاکٹر نسترن احسن فتیحی نے اپنے افسانہ سادہ اوراق میں ذکر کیا ہے۔وہ بے روزگار ہونے کی وجہ سے اپنے کسی دوست کے کہنے پر کسی بکواس کتاب کا تاثرات لکھتا ہے جسے اس کا مصنف کسی مشہور نقاد کے نام شائع کرانا چاہتا ہے جس سے اسے اوارڈ ملنے میں مدد ملے۔اس موضوع کو مصنفہ نے قلم بند کیا ہے۔مندرجہ ذیل اقتباس میں دیکھا جا سکتا ہے:

''"اچھا وہ اس کتاب پر ریویو لکھ دیا۔۔۔رائیٹر ایڈوانس دینے کو تیار تھا میں نے نہیں لئے کہ جتنا اچھا ریویو ہوگا اتنی اچھی قیمت لگواؤنگا۔

"بہت بکواس کتاب ہے یار۔۔۔کیا لکھوں اس پر۔"

"پاگل مت بن۔۔۔سنا ہے بہت پہنچ ہے اس کی،کوئی ایوارڈ کے لئے کوشش میں ہے اچھا سا ریویو لکھ دے،اپنا کیا جاتا ہے۔منھ مانگے پیسے دیگا۔"

"مجھے کیوں دیگا۔۔۔میں کون سا بڑا نقاد ہوں۔۔"

"صحیح کہا۔۔۔تیرے نام سے اسے کیا مطلب،اس کی فکر تو مت کر اب وہ ریویو کس کے نام سے آئے گا اور کیسے،یہ تیرے سوچنے کی بات نہیں۔چل کل صبح آتا ہوں تو آج رات لکھ کر رکھنا۔زیادہ سوچ مت۔۔وقت بہت بدل گیا ہے۔۔۔جینے کے لئے بڑے سمجھوتے کرنے پڑتے ہیں۔۔۔"''(72)

نوکری کرنے والی عورت کے ساتھ کئی طرح کے مسائل پیش آتے ہیں جس وجہ سے وہ اپنے گھر اور کام دونوں کو سنبھالنے میں کہیں کہیں چوک جاتی ہے۔وہ نوکری میں ملنے والے اچھے موقع کا فائدہ وہ نہیں لے پاتی اور اسے اس سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔اس کی ایک اہم وجہ گھریلو زندگی اور گھر کی دوسری ذمے داریاں ہوتی ہیں جو اسے اس موقع کا فائدہ نہیں لینے دیتی ہے۔اس عورت کے لیے اس کا شوہر اس کے بچے اور گھر کے دوسرے افراد زیادہ

اہم ہوتے ہیں۔اگر عورت کے اوپر یہ سب ذمے داریاں نہ ہوتو وہ بھی اپنے کام کی بدولت مرد کے مقابل کامیابی پا سکتی ہے۔وہ اس سے آگے نکلنے کی سلاہیت رکھتی ہے۔ عورت کی اس ذمے داریوں کے موضوع کو بھی مصنفہ نے اپنے افسانہ''پرواہ کسے ہے''میں پیش کیا ہے۔اس میں آشا اپنی ضعیف ماں اور چھوٹے بچوں کی وجہ سے دوسرے ملک جانے کے موقع کا فائدہ نہیں اٹھاتی۔کیوں کہ اس کے لیے یہ لوگ زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔حالاں کہ اگر وہ دوسرے ملک جاتی تو اسے معاشی فائدہ بھی ہوتا اور اس سے اس کے بہت سارے کام آسان ہو جاتے۔اس موضوع کو مصنفہ ڈاکٹر نسترن احسن فتیحی نے پیش کیا ہے جسے مندرجہ ذیل اقباس میں دیکھا جا سکتا ہے۔

''تمھارا سب سے بہتر پرزنٹیشن ہونے کے باوجود یہ اسائنمنٹ باس نے منوج کو دے دیا اب وہ مزے سے کمپنی کے پیسے پر ناروے گھوم کر آئے گا،آشا کی ساتھی کلیگ نے اسے سنایا تو اس نے لاپرواہی سے کندھے اچکا دئے جیسے کہہ رہی ہو۔۔۔"پرواہ کسے ہے۔"اس کے بعد اور زیادہ انہماک سے کمپیوٹر پر جھک گئی۔مگر اب آشا کا ذہن منتشر ہو چکا تھا،یہ صرف گھومنے اور نیا ملک دیکھنے کا فائدہ تو نہیں تھا یہ فائدہ تو معاشی بحران سے باہر نکلنے کا بھی تھا۔مگر "پرواہ کسے ہے!" جیسا چھوٹا سا جملہ اس کا تکیہ کلام بن چکا تھا۔اپنی زندگی میں ہر مشکل سے جوجھتے وقت وہ پرواہ کسے ہے کا گدا گھماتی اور منھ چڑھاتے ہر سوال کو آن کی آن میں زمین بوس کر دیتی۔وہ جانتی تھی کہ ایسے موقعے کا فائدہ وہ اپنی ضعیف ماں اور چھوٹے بچوں کی وجہ سے نہیں اٹھا سکتی تھی دن بھر آفس کی مصروفیت میں وہ اس بات کو بھول گئی۔''(73)

ایسا دیکھا گیا ہے کہ لوگوں کو عطر کی خوشبو سے سکون ملتا ہے اور اس کی مہک انھیں اچھی لگتی ہے۔جب کھانا بن رہا ہوتا ہے تو اس سے کھانے کی خوشبو نکلتی ہے جسے سونگھ کر کبھی کبھی دل گلزار ہو جاتا ہے۔دل کو اچھا لگتا ہے اور اس خوشبو کی وجہ سے بھوک میں اضافہ ہو جاتا ہے اور کبھی کبھی اس کی خوشبو اتنی اچھی اور پیاری لگتی ہے کہ اس خوشبو سے ہی ہمارا من بھر جاتا ہے ہماری بھوک ختم ہو جاتی ہے۔افسانہ نگار ڈاکٹر نسترن احسن فتیحی نے اپنے افسانہ خوشبو میں روٹی کی خوشبو کا ذکر کیا ہے۔اس میں اس نے جمنی کو روٹی کی خوشبو کی دیوانی دِکھایا ہے۔وہ ایک غریب اور بیمار عورت ہے

جسے بچپن سے ہی روٹی کی خوشبو سے بے انتہا پیار ہے لیکن وہ پچھلے کئی دنوں سے روٹی کی اس خوشبو سے محروم ہے اور اسے ایک دن اس کی بیٹی للیا کی وجہ سے دوبارہ اس روٹی کی خوشبو نصیب ہوتی ہے۔ اس کو نسترن فتیحی نے کچھ اس طرح سے پیش کیا ہے:

''اس نے جلدی جلدی آٹا گوندھتے ہوئے کہا تو جمنی کے نحیف چہرے پر مسکراہٹ کی پرچھائیں آئی۔
رہی تھی۔۔۔سیراب کرتی جارہی تھی۔للیا دو روٹی تھالی میں ڈال کر ماں کے قریب آئی اسے اٹھانے کے لئے سہارا دینے کی کوشش کی تو جمنی نے ہاتھ کے اشارے سے اسے منع کیا اپنی کمزور آواز میں کہا۔۔۔"یہ تو کھا لے بیٹی۔۔۔ میرا پیٹ تو اس خوشبو سے ہی بھر گیا۔۔۔"'' للیا روٹی پکا رہی تھی اور جمنی کی نظریں پکتی ہوئی روٹی سے اٹھتی ہوئی بھاپ پر تھیں۔ جو ماحول میں رچ بس کر اس کے روح میں اترتی جا(74)

نسترن احسن فتیحی کے افسانوں کی تعداد بہت کم ہے انہوں نے کم و بیش پندرہ سولہ افسانے لکھے ہیں۔ ان پندرہ والہ افسانوں میں ہی انہوں نے حقیقی زندگی سے جڑے کئی اہم موضوعات کو اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔ ان کے افسانوں میں عورتوں کی زندگی سے جڑے کئی اہم مسائل اور جدو جہد کو دیکھا جا سکتا ہے، اس کے علاوہ یتیم بچوں کی زندگی، آج کل کی صحافت، مسکین کی زندگی سے جڑے اہم موضوع کو افسانہ نگار نے افسانوں کے ذریعے لوگوں کے سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ اس کے افسانوں کا مطالعہ کرنے کے بعد قاری کو احساس ہوتا ہے کہ مصنفہ ان موضوعات کو قاری کے سامنے رکھنے میں کامیاب ہوئی ہیں اور اسے پڑھنے کے بعد قاری کا احساسبھی اجاگر ہوتا ہے اور وہ بھی اس سماج اور دنیا میں ایسے موضوعات سے دوچار ہو رہے لوگوں کے ساتھ ہمدردی کا معاملہ رکھتا ہے یا رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

پلاٹ

مصنفہ نے اپنے افسانوں میں ہر ایک جز پر بہت ہی احتیات اور باریک بینی سے کام لیا ہے۔ ان کے افسانوں کا مطالعہ کرنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے ہر جز کے ساتھ انصاف کیا ہے اور اس میں کامیابی پائی

ہے۔افسانے کا ایک جز پلاٹ ہے۔افسانے میں پلاٹ کا اہم رول ہوتا ہے اگر پلاٹ اچھا نہیں ہوگا تو افسانہ بھی اچھا نہیں ہوگا۔کیوں کہ پلاٹ سے ہی پتہ چلتا ہے کہ افسانہ کیسا ہے؟افسانہ نگار اس بات کا پورا خیال رکھتا ہے کہ اس کے افسانے کا پلاٹ سیدھا اور مربوط ہو اور پڑھنے والے کو ایسا نہ لگے کہ افسانہ اسے باندھ کر نہیں رکھ پا رہا ہے۔ افسانے کے اندر جو بھی واقعات پیش آئے اگر وہ حقیقی زندگی سے مماثلت رکھتی ہے تو یہ قاری کو اپنے سے باندھے ہوئے رکھنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔اگر ایسا نہیں ہوا تو قاری افسانے کو پڑھنے سے بچنے کی کوشش کرے گا اور ہوسکتا ہے تو وہ افسانے کو مکمل کیے بغیر بھی چھوڑ دے۔پلاٹ کے بارے میں وقار عظیم یوں قم طراز ہیں:

''افسانے کا وہ بنیادی خیال یا تصور جس سے افسانہ لکھنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔اس کا موضوع THEME ہے۔اسی موضوع یا THEME کی پھیلی ہوئی شکل پلاٹ ہے۔

پلاٹ کے متعلق ایک خاص بات جو افسانہ نگاری کے فن کے ماہر برابر کہتے چلے آئے ہیں یہ ہے کہ پلاٹ زندگی کے واقعہ کی ہو بہو شکل نہیں ہوسکتا۔وہ زندگی کے کسی خاص واقعے سے کسی نہ کسی حد تک مختلف ضرور ہوتا ہے۔اس کی ترتیب، تعمیر اور تشکیل میں جب تک تھوڑا بہت تصنع نہ ہو، اس کی فنی شکل پیدا نہیں ہوتی۔تصنع کی یہ ہلکی سی چاشنی ہی زندگی کے کسی واقعے کو افسانہ بناتی ہے اور افسانہ بنا کر بھی اسے ایسا رکھتی ہے کہ وہ اصل واقعے سے مختلف ہونے کے باوجود سچ معلوم ہو۔اسے سن کر کسی کے دل میں اس کے غلط ہونے کا شبہ ہرگز پیدا نہ ہو۔وہ ہر لحاظ سے قابلِ یقین ہو۔زندگی میں جو واقعہ جس طرح پیش آیا ہے اسے بغیر فنی نمک مرچ لگائے جوں کا توں لکھ دیا جائے تو اسے واقعہ نگاری کہیں گے، افسانہ نگاری نہیں، خواہ اس میں اچھے افسانے کی ساری خصوصیات کیوں نہ موجود ہوں۔''(75)

نسترن فتیحی نے اپنے ایک افسانے کے پلاٹ میں دکھایا ہے کہ ایک رکشہ والا اپنی سواری کو لے کر بس اسٹینڈ کے لیے چلتا ہے۔اس رکشہ والے کو یہ پتہ ہوتا ہے کہ اس کی سواری کے بس کا وقت ہو چکا ہے اور اسے بس کے لیے دیر ہو رہی ہے۔اسے بس کے چھوٹنے کا اندیشہ بھی ہے مگر رکشہ والے کو پتہ ہے کہ وہ اسے وقت پر بس اسٹینڈ

پہنچادے گا اوراسے دہلی جانے والی پہلی بس بھی مل جائے گی۔سواری بھی یہ سوچتا ہے کہ اگر اسے بس مل جاتی ہے تو وہ اس رکشے والے کو زیادہ پیسے دے گا کیوں کہ اس کی وجہ سے اسے بس مل جائے گی اور وہ اس نقصان سے بچ جائے گا جو اسے بس کے چھوٹ جانے کی وجہ سے ہوگا۔جب رکشہ والا بس اسٹینڈ پر پہنچتا ہے تو اس کی سواری رکشے کو پوری طرح رکنے بھی نہیں دیتا ہے اور وہ رکشہ سے اتر جاتا ہے کیونکہ دہلی جانے والی بس روانہ ہونے کے لیے بالکل تیار تھی اور وہ بس اسٹینڈ سے نکل کر گیٹ تک آ چکی تھی۔مصنفہ کے افسانے کا یہ اقتباس دیکھیں:

’’مل جائے گی بس صاحب۔۔۔چار تو ابھی نہیں بجے نا۔۔۔اب زیادہ دور نہیں ہے۔وہ اپنی پھولتی سانسوں میں بھی مسلسل باتیں کئے جا رہا تھا۔۔۔جیسے مجھ سے زیادہ خود کو تسلی دے رہا ہو۔

میری ناامیدی بھی امید میں بدل رہی تھی۔۔۔۔اور میں سوچ رہا تھا کہ آج اسے پچاس روپے کی جگہ دوسو ضرور دے دوں گا۔دل اس اجنبی اور غریب بیمار شخص کے لئے احساس تشکر سے بھر گیا۔

وہ رہا بس اسٹینڈ صاحب۔۔۔وہ خوشی سے چلایا۔۔میرے چہرے پر بھی رونق دوڑ گئی۔۔ قریب پہنچنے پر دلی جانے والی پہلی بس بالکل سامنے ہی کھڑی نظر آ گئی، نکلنے کو بالکل تیار۔۔وہ اسٹینڈ سے نکل کر گیٹ کے پاس کھڑی تھی ڈرائیور اپنی سیٹ پر موجود اور انجن اسٹارٹ۔۔۔۔میں رکشہ پوری طرح رکنے سے پہلے ہی کود کر اترا اور جیب سے پرس نکال کر پیسے نکالنے لگا۔۔۔رکشہ والا بھی ایک طرف رکشہ روک کر کنارے کھڑا فتح مندی سے میری طرف دیکھتے ہوئے اپنا پسینہ خشک کر رہا تھا۔۔۔‘‘(76)

مذکورہ بالا اقتباس میں مصنفہ کے افسامیں پلاٹ کی کامیابی دیکھی جا سکتی ہے۔جب ہم اس افسانے کو پڑھتے ہیں تو ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ اس افسانے کا پلاٹ کتنا سادہ اور سیدھا ہے۔اس میں ہمیں کسی طرح کا کوئی جھول نظر نہیں آتا۔اس افسانے کے پلاٹ میں وقت کی اہمیت اور ایک محنت کش شخص کے خلوص کو بخوبی دکھایا گیا ہے۔حقیقی زندگی میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے کہ رکشے والے کو پتہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی سواری کو کسی جگہ کتنے وقت میں پہنچا سکتا ہے۔

گرمی کے موسم میں جب بجلی چلی جاتی ہے تو گھر کے اندر بیٹھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ دن کے وقت اگر بجلی چلی جائے تو ہم اپنے گھر کے اندر ہی رہنا پسند کرتے ہیں لیکن جب شام کے وقت بجلی چلی جاتی ہے تو ہم اپنے گھر سے باہر نکل آتے ہیں۔ سوسائٹی میں رہنے والوں کے لیے فلیٹ کے سامنے لان یا میدان بنا ہوتا ہے اسی میں وہ لوگ جمع ہونے لگتے ہیں۔ عورتیں آپس میں باتیں کرنے لگتی ہیں اور بچے ایک دوسرے کے ساتھ گرمی کی پرواہ کیے بغیر آپس میں کھیلنے کودنے لگتے ہیں۔ بجلی نہ ہونے کی وجہ سے پانی بھی نہیں مل پاتا ہے کیوں کہ بجلی سے ہی موٹر چلتی ہے اور فلیٹ میں پانی آتا ہے۔ جب پانی نہیں ہوگا تو برتن بھی صاف نہیں ہو پاتا اور گندے برتن میں کھانا نہیں بنایا جا سکتا ۔مندرجہ ذیل اقتباس مصنفہ کے افسانہ ڈائل ٹون سے لیا گیا ہے جس میں ایک کامیاب پلاٹ دیکھا جاسکتا ہے:

''شام گہری ہوئی تو گرمی سے پریشان لوگ اپنے اپنے فلیٹ سے باہر نکلنے لگے ہیں۔۔۔عورتیں اور بچے بھی ادھر اُدھر سے نکل کر فلیٹ کے سامنے بڑے لان میں جمع ہو رہے ہیں سب کے چہروں پر بے زاری جھلک رہی ہے۔۔۔بجلی نہ ہونے سے نلکوں میں پانی بھی نہیں آرہا ہے اور پانی نہ آنے سے برتن نہیں دھلے ہیں، تو کھانا کیسے بنے۔۔۔بچّے البتہ ناسازگار ماحول میں بھی کھیل کود میں فوراً محو ہو جاتے ہیں اور یہاں بھی ان کا گروپ الگ طرح کے کھیلوں میں مصروف ہوتا جار ہا ہے۔

"ارے بھائی۔۔۔کوئی ٹرانس فورمر جل گیا ہے۔۔۔ابھی ابھی بجلی دفتر میں فون کیا تو معلوم ہوا۔۔۔دو گھنٹے اور لگیں گے اسے ریپئر (repair) ہونے میں۔" ساہنی نے اس کی طرف آتے ہوئے اطلاع دی۔۔

جب نیا نیا فون ہو تو جوش میں انسان اسے جلدی ہی کھڑکاتا ہے۔ اس نے سوچا اور روکھی سی ہوں سے ساہنی کو ٹالنا چاہا۔۔۔مگر جس خطرے کو اس نے پہلے ہی سونگھ لیا تھا وہ سامنے آیا اور ساہنی نے اگلا سوال داغا۔۔۔''(77)

مذکورہ بالا اقتباس پر جب ہم اپنی نظر ڈالتے ہیں تو پاتے ہیں کہ اس کا پلاٹ ترتیب وار اور مربوط قسم کا ہے ایک دوسرے سے گتھا ہوا ہے اور ہمارے حقیقی زندگی سے بہت حد تک ملتا ہے۔ اس کہانی کے پلاٹ میں مصنفہ نے ان سبھی چھوٹی سی چیزوں کو بخوبی دکھایا ہے کوئی بھی چیز فالتو یا کم نہیں پیش کیا ہے۔ اس کہانی میں یہ بھی دکھایا ہے

کہ ساہنی صاحب جس کے یہاں ٹیلی فون لگا ہوا ہے وہ بجلی آفس میں فون کر کے پتہ کرتا ہے کہ آخر بجلی گئے اتنا وقت ہو گیا ہے ابھی تک بجلی آئی کیوں نہیں؟۔ پھر وہ اپنے سوسائٹی کے لوگوں کو اطلاع کرتا ہے کہ کوئی ٹرانس فورمر جل گیا ہے اور اسے بننے میں دو گھنٹہ سے زائد کا وقت لگے گا۔ ہماری حقیقی زندگی میں بھی ساہنی جیسے لوگ ہوتے ہیں جو اپنا واہ واہی چاہتے ہیں اور لوگوں کو اپنی طرف سے بغیر پوچھے کسی چیز کے بارے میں بتاتے رہتے ہیں۔ان سبھی باتوں سے یہ صاف ہے کہ مصنفہ اپنے کہانی کا پلاٹ سادہ اور ترتیب وار رکھنے میں کامیاب ہوئی ہیں۔

جب انسان باہر سے کام کر کے اپنے گھر تھکا ماندا واپس آتا ہے اور سوسائٹی میں رہنے والے انسان کا لفٹ اگر خراب ہو تو اسے فلیٹ میں جانے کے لیے سیڑھی کا سہارا لینا پڑتا ہے۔سیڑھی چڑھ کر انسان تھک جاتا ہے گھر پہنچ کر وہ تھوڑی دیر آرام کرنا چاہتا ہے۔ مصنفہ نے اپنے ایک افسانہ ''پرچھائیں'' میں اسی طرح کے حال کو دکھانے کی کوشش کی ہے۔مصنفہ کے افسانے کا یہ اقتباس دیکھیں:

> ''صبا نے سبزی کا تھیلا ڈائننگ ٹیبال پر رکھا اور کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ اسے تھکن زیادہ ہے یا پیاس۔گھر پہنچ کر تھیلے اور پرس سے چھٹکارا پانے کے بعد دو قدم بڑھا کر اب اس سے فرج تک بھی نہ جایا جا سکا، لیکن پیاس سے ہونٹ سوکھ رہے تھے،اکتوبر کے اوائل میں گرمی اتنی شدید نہیں ہوتی لیکن چڑھتے سورج کی دھلی دھلائی سفید دھوپ کی تپش نے جیسے جسم سے پانی ہی نہیں خون بھی نچوڑ لیا ہو۔اس نے سامنے بڈ روم میں بستر پر اپنے دونوں پیر پھیلائے گود میں لیپ ٹاپ رکھے اپنی بڑی بیٹی پنکی کو دیکھا،وہ اپنے فیس بک کے دوستوں کی دنیا میں گم تھی،تبھی دوسرے کمرے سے راجو آیا پارے کی طرح تھرکتا ہوا۔۔۔
>
> "آپ آ گئیں ممی! بہت بھوک لگی ہے۔"اس نے فرج پر رکھی ٹوکری سے ایک سیب اٹھایا۔
>
> "ہاں لفٹ خراب ہے،چار منزل چڑھتے چڑھتے حالت خراب ہو گئی۔۔۔ ذرا پانی تو پلاؤ۔"
>
> "یے۔یے۔یے۔۔"پاس کے کمرے سے شور کی آواز آئی۔کوئی وکٹ گرا

تھا، راجو اپنی آواز بھی اس شور میں شامل کرتا ہوا دھر دوڑ گیا اور صبا کے الفاظ اس شور میں گم ہو گئے۔'' (78)

مذکورہ بالا اقتباس مصنفہ کے افسانہ ''پرچھائیں'' سے لیا گیا ہے۔اس اقتباس کو جب ہم اپنی پینی نظر سے دیکھتے ہیں تو پاتے ہیں کہ اس کہانی کا پلاٹ ترتیب وار اور سادہ ہے۔اس کہانی میں مصنفہ نے دکھایا ہے کہ اکتوبر کے مہینے میں گرمی بہت زیادہ تو نہیں ہوتی ہے مگر دن کے چڑھتے سورج کی سفید دھوپ جسم سے پانی نچوڑ لیتی ہے۔صبا باہر سے سبزی وغیرہ لے کر اپنے فلیٹ تک سیڑھی چڑھ کر آتی ہے جس کی وجہ سے وہ بہت زیادہ تھکا ہوا محسوس کرتی ہے اس کے ہونٹ پیاس کی وجہ سے سوکھ جاتے ہیں۔وہ اپنے گھر کے اندر داخل ہونے کے بعد کرسی پر بیٹھ جاتی ہے تاکہ وہ کچھ دیر آرام کر سکے اپنے جسم کی توانائی کو واپس پا سکے اور وہ بیٹھے بیٹھے اپنے گھر کے سبھی افراد کو دیکھتی ہے کہ کون کیا کرر ہا اور کون کس کام میں مشغول ہے؟۔وہ اپنے بچوں کو پانی کے لیے آواز لگاتی ہے کہ کوئی اسے پانی پینے کے لیے دے مگر اسے کوئی پانی نہیں دیتا ہے۔اس کے بعد صبا خود اٹھ کر فرج سے بوتل نکال کر پانی پیتی ہے۔اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ مصنفہ نے کہانی کا پلاٹ سیدھا رکھا ہے اور ہر چیز ترتیب وار بیان کی ہے۔

مصنفہ ڈاکٹر نسترن احسن فتیحی نے اپنے افسانوں میں پلاٹ پر کافی دھیان مرکوز رکھا ہے اور ان کے افسانوں کا جب مطالعہ کرتے ہیں تو اس میں اس کی کامیابی نظر آتی ہے۔جس کا اندازہ اوپر آئے تمام اقتباسات سے ہوتا ہے اور یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ انہوں نے پلاٹ کو بہت ہی کامیابی اور خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔مصنفہ کے افسانوں کا مطالعہ کرنے پر ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کے افسانوں کا پلاٹ بہت ہی سادہ اور مربوط ہے کہیں بھی ایسا نہیں لگتا کہ افسانہ پلات کے لہاز سے کمزور ہے۔

اسلوب

مصنفہ ڈاکٹر نسترن احسن فتیحی نے اپنے افسانوں کو لکھتے وقت افسانے کے ہر جز پر پورا پورا دھیان رکھا ہے۔ اس کے افسانوں کا اسلوب بھی سادہ اور صاف ستھرا ہے اپنی بات کو قاری تک ترتیب وار اور اچھے لفظوں میں پہنچایا ہے۔فسانوں کی کہانی کو پڑھتے وقت ایسا لگتا ہے کہ ہاں واقعی میں ایسا ہوا ہوگا۔مصنفہ نے غیر حقیقی چیزوں سے گریز کیا ہے اور مصنفہ نے غیر ضروری باتوں سے بھی اپنے افسانوں کو بچایا ہے۔ایسا بھی نہیں ہے کہ ان کے افسانوں میں

کسی چیز کی ضرورت تھی اور انہوں نے اسے اچھے اسلوب کے ساتھ پیش نہ کیا ہو۔ اس کی مثال ہمیں اس کے افسانوں میں جگہ جگہ دیکھنے کو ملتی ہے۔

ایک عورت ایک ساتھ کئی کردار ادا کرتی ہے۔ ماں، بیوی اور بیٹی کے کردار میں اپنی ذمہ داریوں کو بہت اچھے سے سمجھتی ہے اور اسے پورا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ ہاں کبھی کبھی کسی وجہ سے وہ اس میں نا کام ہوتی ہے تو موقع ملتے ہی وہ اسے پورا کرنے کی دوبارہ کوشش کرتی ہے۔ ایک نوکری پیشہ عورت کے لیے اس طرح کی پریشانی زیادہ ہوتی ہے۔ وہ وقت کی کمی کی وجہ سے اپنی ماں اور بیوی ہونی کی ذمہ داریاں پوری نہیں کر پاتی لیکن وہ اس کے لیے مسلسل کوشش کرتی نظر آتی ہے۔ ایسے ہی حالات کو مصنفہ نے اپنے افسانہ پرچھائیں میں سادہ اور سہل الفاظ کے ساتھ پیش کیا ہے جس میں صبا ایک نوکری پیشہ عورت ہے اور چھٹی کے دن اپنے شوہر اور بچوں کے لیے اچھا کھانا تیار کرتی ہے۔ اس کہانی کو مصنفہ نے ترتیب وار اور صاف ستھرے الفاظ کے ساتھ بہت ہی کامیاب اسلوب کے ڈھانچے میں پیش کیا ہے جسے مندرجہ ذیل اقتباس میں دیکھا جا سکتا ہے:

’’کھانا تیار ہو چکا تھا گرم گرم کھانا۔۔۔ صبا کو خوشی ہے کہ وہ آج اپنے سارے کام پر اپنے بچوں اور شوہر کو ترجیح دے کر ان کے لیے ترو تازہ کھانا تیار کر پائی ہے، جو روز نہ کر پانے پر اس کے اندر دہائیوں پلے والی عورت اسے کچو کے لگاتی رہتی ہے۔ اور اسے اندر سے خوش نہیں رہنے دیتی مگر اس وقت صبا نے گنگناتے ہوئے ٹیبل پر کھانا لگایا سلاد، رائتہ، گوبھی۔ مٹر اور ٹماٹر کی سبزی، دال، زیرہ چاول اور گرم گرم گھی لگی روٹیاں۔ وہ پنکی اور منی کو آواز دیتی ہوئی بلال اور راجو کو بلانے چلی جاتی ہے۔۔۔

"چلو کھانا تیار ہے۔ اسے ایک منٹ کی دیر بھی اب منظور نہیں۔۔۔"

"ارے صبا بور مت کرو لاسٹ اوور چل رہا ہے۔"

صبا کو غصہ آتا ہے۔۔ "راجو تمہیں بھوک لگی تھی؟؟؟"

"ممی یہیں پر پلیٹ میں لا دیں نا۔۔ پلیز۔۔!"

"ہاں صبا۔۔۔ یہیں پر پلیٹ میں دے دو۔۔ ایک دن تو چھٹی کا ملا ہے اسے اپنے طور پر جینے دو۔۔۔"

وہ پلٹ کر جانے لگتی ہے "تمہاری ممی کو اس کے علاوہ اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔۔۔کھانا کھانا بس ہر وقت کھانا۔۔۔" بلال اور راجو ایک ساتھ ہنستے ہیں۔۔۔۔صبا کو لگتا ہے اس کی بونی پر چھائیں اس کے قدموں سے الگ ہو کر اس پر ہنس رہی ہے۔

صبا کا سر ناچ رہا ہے نہ جانے تھکن سے، مایوسی سے یا غصے سے، اس سے زیادہ اس کے اندر والی عورت مجروح ہوئی ہے۔'' (79)

انسان کسی کے سوال کے جواب میں جب کوئی بات سمجھا تا ہے یا سمجھانے کی کوشش کرتا ہے تو اس کے ذہن میں یہ بات ہوتی ہے کہ وہ جو کچھ بھی بتا رہا ہے یا کہہ رہا ہے یا سمجھانے کی کوشش کر رہا ہے وہ سننے والے کو اچھے سے سمجھ میں آجائے اور وہ اس کے جواب سے مطمئن ہو جائے۔اس طرح کے حالات ہم سبھی کے زندگی میں اکثر آتے ہیں جہاں ہمیں کسی کے سوال کا جواب دینا پڑتا ہے۔مصنفہ کے افسانہ کال بیلیا میں ''نرملا جوگن'' جب اپنے بابا سے پوچھتی ہے کہ اس کے قبیلے کے لوگ در در بھٹکنے اور خانہ بدوشی کی زندگی کو چھوڑ کر ایک جگہ اپنا مکان بنا کر کیوں نہیں رہتے ؟۔تو اس کا باپ اسے سمجھاتا ہے کہ اسے کال بیلیا کیوں کہا جاتا ہے اور اس کا مطلب کیا ہے۔اس بات کو مصنفہ نے بہت ہی سادہ طریقے سے اور اچھے انداز و اسلوب کے ذریعہ قاری کے سامنے پیش کیا ہے جسے مندرجہ ذیل اقتباس میں دیکھا جا سکتا ہے:

''نرملا جوگن اپنے بابا سے اپنے قبیلے کی حالت اور طور طریقوں پر سوال جواب کرنے لگی۔۔۔اسے دوسری دنیاؤں کے سامنے اپنے قبیلے کی کسمپرسی تکلیف دینے لگی۔۔۔وہ اپنے باپ سے کہتی۔۔۔"بابا اب دھوپ میں بھٹک کر سانپ کو ڈھونڈنا چھوڑ دو۔"

"ناگ کو ٹوکری میں بند کر کے اس کا تماشہ دکھانا چھوڑ دو۔۔۔" اور اس کا باپ ہنستا ہوا پیار سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہتا۔"جانتی ہے ہمیں کال بیلیا کیوں کہا جاتا ہے؟"

وہ نفی میں سر ہلا دیتی تو بتاتا۔

" کیونکہ ہم موت کے ساتھی ہیں کال مطلب موت اور بیلیا ساتھی کو کہتے

ہیں۔۔۔ہم موت کے ساتھی ہیں جبھی تو ہم زہریلے سانپوں کے بلوں میں ہاتھ
ڈال سکتے ہیں، انہیں بیلی بنا سکتے ہیں اور سانپ کسی کو کاٹ لے تو اس کا زہر بھی
اتار سکتے ہین، تو نے دیکھا تھا نا اس دن زمیندار کے بیٹے راجیش کو سانپ نے
کاٹا تو تیرے بابا کے پاس کیسے دوڑے آئے سب، یہ ہنر ہے، یہ ہمارے
پرکھوں کا اثاثہ ہے۔"‘‘(80)

بازار ایک ایسی جگہ ہے جہاں پر لوگوں کی بہتات لگی ہوتی ہے۔ بازار میں کئی طرح کے لوگ ہوتے ہیں کوئی اپنی ضرورت کا سامان خریدنے جاتا ہے، کوئی سامان بیچنے کے لیے جاتا ہے تو کوئی تفریح کرنے کے لیے جاتا ہے۔ اس بازار کے بھیڑ بھاڑ میں عورتیں محفوظ ہونے کے بجائے اپنے آپ کو زیادہ خطرے میں محسوس کرتی ہیں، کیوں کہ اس میں کچھ اوباش قسم کے لوگ بھی ہوتے ہیں جو عورتوں کو بری نظر سے دیکھتے ہیں اس کے ساتھ بدتمیزی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس طرح کے لڑکے صرف بازار میں ہی نہیں ملتے اب تو یہ اپنی ہی گلی محلے میں بھی کھڑے مل جاتے ہیں۔ ایک نوکری پیشہ عورت کا تو اس طرح کے لڑکوں اور ماحول سے روزانہ سامنا ہوتا ہے۔ عورتوں کو بسوں میں، راستے میں یہاں تک کہ دفتر میں بھی اس طرح کی بری نظر رکھنے والے اوباش قسم کے لوگ ملتے ہیں۔ اس بات کو مصنفہ نے اپنے افسانہ ’’پرواہ کسے ہے‘‘ میں بہت ہی کم الفاظ کے ساتھ خوبصورت اسلوب کے ذریعہ پیش کیا ہے جسے مندرجہ ذیل اقتباس میں دیکھا جا سکتا ہے:

’’گلی میں کچھ اوباش قسم کے لڑکے غول کی شکل میں ادھر ادھر کھڑے تھے اور
اب بھوکی نظریں پھل کی تھیلی پر نہیں اس پر تھیں۔۔۔وہ بے نیازی دکھاتی سب
سے بچتے بچاتے گھر میں داخل ہوئی اور باہر کی ساری فکر بھول گئی۔۔۔اب
ایک نیا محاذ سامنے تھا۔۔۔کام والی نہیں آئی تھی، وہ پرس پھینک کر مشین کی طرح
کام میں لگ گئی، مگر ماں کی مسلسل بڑبڑاہٹ اسے غصہ دلانے لگی۔ جب سوتے
وقت وہ ماں کو دوا کھلانے آئی تو وہ پھر بولی۔

" کتنی بار کہا بائی بدل لے، تو نے کچھ کھایا بھی کہ نہیں؟۔۔۔اور پربھات کو
فون تو کر اتنی دیر ہو گئی لگتا ہے پھر دوستوں کے ساتھ کہیں محفل جما کر بیٹھا ہوگا
بیوی بچوں کی فکر ہی نہیں، آ کر کب آئے گا؟"

"اوہ تو پرواہ کسے ہے؟؟؟؟،سب ہو گیا نا۔۔۔اب سو جاؤ۔۔۔" وہ جھلا کر بولی اور اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گئی۔۔۔ ہر بات پر پرواہ کسے ہے کا گردان کرنے والی کا تکیہ آنسوؤں سے بھیگ گیا۔''(81)

آج کل کی تعلیم یافتہ عورت کو قناعت اور صبر کے ساتھ رہنے میں نہ جانے کیا دشواری ہوتی ہے؟ اگر اس کے پاس کبھی کسی وجہ سے مالی تنگی ہو جائے یا اس کے مالی حالات خراب ہونے لگے تو وہ اپنے ان حالات سے نکلنے کے لیے اپنی ازدواجی زندگی سے باہر نکل کر نوکری کرنا چاہتی ہے۔ اسے اس وقت قناعت سے کام لینے کی ضرورت ہوتی ہے مگر وہ نوکری کرنا زیادہ پسند کرتی ہے۔ جب وہ نوکری کرنے لگتی ہے تو اس کے پاس اپنے گھر کے افراد اور اپنے شوہر اور بچوں کے لیے بھی وقت کی کمی ہو جاتی ہے اور وہ وقت نہیں نکال پاتی۔ اس طرح وہ کچھ پانے کے لیے بہت اہم چیز قربان کر دیتی ہے۔ کبھی کبھی اسے اس بات کا احساس بھی ہوتا ہے کہ نوکری کرنے سے بہتر وہ صبر اور قناعت سے کام لیتی تو زیادہ بہتر ہوتا۔ اسی سے مماثلت رکھتا ہوا ایک نوکری کرنے والی عورت کا حال مصنفہ کے افسانہ ''ایڈ ہیسو'' میں پیش آیا ہے جس میں نوکری پیشہ ''نشی'' کو اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ اس کے گھر اور اس کی شخصیت میں جو بکھراؤ پیدا ہوا ہے اس کی ذمہ دار وہ خود ہے۔ اسی کو مصنفہ نے بہت ہی خوبصورتی کے ساتھ صاف ستھرے اسلوب اور لفظوں کے ساتھ لکھا ہے جسے مندرجہ ذیل اقتباس میں دیکھا جا سکتا ہے:

''مگر وہ کسے الزام دے۔ اپنی شخصیت کے اس بکھراؤ کی ذمہ دار بھی تو وہ خود ہے۔ جب راحل تنہا زندگی کی آسائشوں کو مہیا کرنے کے لئے جوجھ رہا تھا تب اس نے قناعت سے کام نہ لے کر بے صبری دکھائی تھی۔ تب ہر پل نئے دور کی تعلیم یافتہ عورت ہونے کا گمان اسے ملامت کرتا کہ وہ چار دیواری میں قید ایک خاموش تماش بین ہے۔۔۔ اور تب ہر رکاوٹ کو نظر انداز کر کے اس نے یہ چار دیواری لانگھ لی تھی۔ مگر اس وقت اسے اس کا بالکل اندازہ نہیں تھا کہ وہ اپنا کیا کچھ قربان کر رہی ہے۔۔۔ اب آج جب ان کے پاس سب کچھ ہے تو ان آسائشوں سے لطف اندوز ہونے کی فرصت نہیں۔ یہ کیسا شراپ ہے اس دور کی زندگی کو۔۔۔ اس نے اپنی کربناک سوچوں سے پیچھا چھڑانے کے لئے خود کو بستر سے گھسیٹ کر باہر نکالا۔''(82)

غریبی انسان کے لیے ایک بددعا ہے اوراس سے ہر کوئی بچنا چاہتا ہے۔غریبی کی وجہ سے انسان دو وقت کی روٹی بھی نہیں کھا سکتا۔ جب انسان دو وقت کی روٹی نہیں کھاتا ہے تو اس کا جسم کمزور ہونے لگتا ہے اوراس طرح وہ بیمار رہنے لگتا ہے۔جس انسان کے پاس کھانے کے لیے پیسہ نہیں ہے وہ اپنا علاج کیسے کرا سکتا ہے۔ جب یہ صورت حال کسی ماں کے ساتھ پیش آتی ہے تو وہ اس غریبی اور بیمار جسم سے جوجھتے ہوئے بھی اپنے بچے کے لیے ہمیشہ فکر مند رہتی ہے کہ جس حال سے وہ گزر رہی ہے اس حال سے اس کے بچے نہ گزرے۔اسی طرح کی غریبی اور بیماری سے جوجھ رہی ایک غریب عورت جمنی اوراس کی لڑکی للیا کی کہانی کو مصنفہ ڈاکٹر نسترن احسن فتیحی نے اپنے افسانہ خوشبو میں اچھے لفظوں کا استعمال کر ایک اچھے اسلوب کے ڈھانچے میں ڈھال کر پیش کیا ہے۔اس کا اندازہ مندرجہ ذیل اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے:

> ''جمنی نے کھانستے کھانستے اپنا سینہ دبا لیا۔ پھر کھانسی کے زور پر مشکل سے قابو پاتے ہوئے اس نے اپنی دھندلی نظروں کو ادھر ادھر گھماتے ہوئے بے حد نحیف آواز میں اپنی بیٹی کو پکارا۔۔۔"للیا۔۔۔ارے او للیا۔۔۔"
>
> للیا اس ایک کمرے کے کچّے مکان کے دروازے پر اپنے پیر پھیلائے یوں بیٹھی تھی جیسے کسی محل کی راج کماری ہو۔اس کے سانولے تندرست چہرے پر بھولے پن کے ساتھ ساتھ ایک قسم کا غرور بھی جھلکتا تھا۔۔۔ماں کی پکار پر اس نے ناگواری سے اندر ایک جھلنگی چار پائی پر سمٹی ہوئی ماں کی کمزور وجود کی طرف دیکھا اور پھر اسی لاپرواہی سے چپ چاپ بیٹھی رہی۔''(83)

مذکورہ بالا اقتباس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ نہ صرف غریبی اور لاچارگی انسان کے لیے وبال جان ہوتی ہے بلکہ نافرماں بردار اولاد بھی کسی مصیبت اور پریشانی سے کم نہیں ہوتی۔اس اقتباس میں انسان کے بوڑھاپے اور بیماری دونوں کے بارے میں صاف معلوم ہوجاتا ہے اور ساتھ ہی بے درد اولاد کی لاپرواہی کا بھی احساس ہوتا ہے۔ ایک اور بات جو کہ بہت بڑا سبق دیتی ہے وہ یہ کہ انسان کا جوانی میں پورغرور اور اپنے گرم خون کی وجہ سے کم عقلی کا شکار ہونا اور اپنے خونی رشتوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنی جوانی کے دنوں کو یوں ہی بیکار کاموں میں صرف کرنا ہے جس کی ایک زندہ مثال مذکورہ اقتباس میں دیکھنے کو ملتی ہے۔

حواشی

(1) آل احمد سرور، نظر اور نظریے، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اشاعت 2011،ص 56

(2) ڈاکٹر ارتضٰی کریم، اردو فکشن کی تنقید، تخلیق پبلشرز نئی دہلی، اشاعت 1996،ص 21

(3) وقار عظیم، داستان سے افسانے تک، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، اشاعت 2003،ص 66

(4) ڈاکٹر محمد احسن فاروقی۔ڈاکٹر سید نورالحسن ہاشمی، ناول کیا ہے؟، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، اشاعت 2006،ص 38

(5) نسترن احسن فتیحی، لفٹ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، اشاعت 2017،ص 5

(6) ایضاً،ص 140

(7) ایضاً،ص 84-85

(8) ایضاً،ص 53

(9) ایضاً،ص 106

(10) ایضاً،ص 107

(11) ایضاًص 111-112

(12) ایضاً،ص 41

(13) ایضاً،ص 83-84

(14) ایضاً،ص 125-126

(15) ڈاکٹر محمد احسن فاروقی۔ڈاکٹر سید نورالحسن ہاشمی، ناول کیا ہے؟، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، اشاعت 2006،ص 34

(16) نسترن احسن فتیحی، لفٹ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، اشاعت 2017،ص 9

(17) ایضاً, ص 109

(18) ایضاً, ص 114

(19) نسترن احسن فتیحی ،لفٹ،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی،اشاعت 2017،ص40

(20) ایضاً, ص101-102

(21) ایضاً, ص29)

(22) ڈاکٹر محمد احسن فاروقی۔ڈاکٹر سید نور الحسن ہاشمی ،ناول کیا ہے؟،ایجوکیشنل بک ہاؤس،علی گڑھ،

اشاعت 2006،ص31

(23) نسترن احسن فتیحی ،لفٹ،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی،اشاعت 2017،ص10

(24) ایضاً،ص18-19

(25) ڈاکٹر محمد احسن فاروقی۔ڈاکٹر سید نور الحسن ہاشمی ،ناول کیا ہے؟،ایجوکیشنل بک ہاؤس،علی گڑھ،

اشاعت 2006،ص23

(26)(ایضاً،ص17

(27) ایضاً،ص162

(28) ایضاً،ص97

(29) ایضاً،ص40

(30) نسترن احسن فتیحی ،لفٹ،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی،اشاعت 2017،ص86-87

(31) ایضاً،ص44

(32) ایضاً،ص88

(33) ڈاکٹر محمد احسن فاروقی۔ڈاکٹر سید نور الحسن ہاشمی ،ناول کیا ہے؟،ایجوکیشنل بک ہاؤس،علی گڑھ،

اشاعت 2006،ص20-21

(34) نسترن احسن فتیحی ،لفٹ،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی،اشاعت 2017،ص74

(35) ایضاً،ص127

(436) ایضاً،ص14

(37) نسترن احسن فتیحی ،لفٹ ،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس ،دہلی ،اشاعت 2017 ،ص89

(38) ایضاً،ص38

(39) ایضاً،ص49

(40).ایضاً،ص12

(41) ایضاً،ص126

(42) ایضاً،ص140

(43) ایضاً،ص30

(44) ایضاً،ص82

(45) وقار عظیم،فن افسانہ نگاری ،ایجوکیشنل بک ہاؤس،علی گڑھ ،اشاعت 1997 ،ص31

(46) ایضاً،ص94-95

(47) ایضاً،ص133-134

(48) ایضاً،ص137

(49) ایضاً،ص53

(50) افسانہ کشمکش

(51) افسانہ ڈائل ٹون

(52) افسانہ پرچھائیں

(53) ایضاً

(54) افسانہ کال بیلیا

(55) افسانہ نسل

(56) افسانہ کشمکش

(57) افسانہ ڈائل ٹون

(58)افسانہ پرچھائیں

(59)افسانہ کال بیلیا

(60)افسانہ خوشبو

(61)وقار عظیم ،فن افسانہ نگاری، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، اشاعت 1997 ،ص157

(62)افسانہ کشمکش

(63)افسانہ ڈائل ٹون

(64)افسانہ سادہ اوراق

(65)افسانہ خوشبو

(66)افسانہ ڈائل ٹون

(67)وقار عظیم ،فن افسانہ نگاری، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، اشاعت 1997 ،ص50

(68)افسانہ کشمکش

(69)افسانہ ڈائل ٹون

(70)ایضاً

(71)افسانہ کال بیلیا

(72)افسانہ سادہ اوراق

(73)افسانہ پرواہ کسے ہیو

(74)افسانہ خوشبو

(75)وقار عظیم ،فن افسانہ نگاری، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، اشاعت 1997 ،ص63-64

(76)افسانہ کشمکش

(77)افسانہ ڈائل ٹون

(78)افسانہ پرچھائیں

(79)افسانہ پرچھائیں

(80)افسانہ کال بیلیا

(81)افسانہ پرواہ کسے ہے

(82)افسانہ ایڈیسو

(83)افسانہ خوشبو

حاصل مطالعہ

میرے ایم فل کا مقالہ بعنوان ''نسترن احسن فتیحی کی فکشن نگاری کا مطالعہ'' مختلف مراحل سے گزر کر مکمل ہو چکا ہے۔کوئی بھی تحقیق حرف آخر نہیں ہوتی۔اس لیے میرا تحقیقی مقالہ بھی حرف آخر نہیں ہوسکتا۔اس میں بھی کچھ کمیاں ہوسکتی ہیں۔راقم الحروف نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی ہے کہ اپنے مقالے کو عنوان کی حد میں رکھے اور اس کے ساتھ انصاف کر سکے۔اس لیے اس مقالے کو اپنے نگراں ڈاکٹر محمد زاہد الحق صاحب کے مشورے سے تین ابواب میں منقسم کیا ہے۔اس مقالے کے گذشتہ صفحات میں ان تینوں ابواب میں نسترن احسن فتیحی کی علمی اور ادبی کارناموں کا علیحدہ علیحدہ جائزہ لیا گیا ہے۔عموماً یہ ہوتا ہے کہ مقالے کے آخر میں حاصل مطالعہ یا ما حاصل قلم بند کیا جاتا ہے۔ایسا اس لیے کیا جاتا ہے کہ قاری کو ایک مرتبہ پھر سے ان سبھی اہم نکات سے بازیافت کرائی جائے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔اس بات کا خیال رکھتے ہوئے راقم الحروف نے مقالے کے اہم نکات کو مختصراً قلم بند کردینے کی کوشش کی بالخصوص نسترن احسن فتیحی کی ادبی خدمات اور اس کی اردو ادب میں حیثیت کے متعلق سے بتانے کی پوری سعی کی ہے۔

۔مصنفہ نے پورے اعتماد کے ساتھ نوے کی دہائی میں ایم اے کرنے کے دوران پہلا افسانہ ''تشنگی'' لکھا، یہ افسانہ ''شاعر'' ممبئی سے شائع ہوا۔اس طرح مصنفہ اردو ادب میں اپنے تخلیقی قدم رکھتی ہیں۔مصنفہ کی تصانیف کی تعداد ان کی عمر کی طوالت کے حساب سے بہت کم ہیں لیکن جتنی بھی تصانیف ہیں وہ قابل دید اور ستائش ہیں۔

نسترن احسن فتیحی کا اب تک صرف ایک ناول ''لفٹ'' منظر عام پر آیا ہے۔انہوں نے اسے پہلی مرتبہ 2003 میں شائع کرایا تھا۔اس ناول کا دوسرا ایڈیشن 2017 میں شائع کرایا۔پہلے اور دوسرے اڈیشن میں ناول کے اندر کوئی تبدیلی نہیں کی گئی ہے۔صرف اس میں غضنفر اور صغیر افراہیم کے تاثرات کو فلیپ کی شکل میں ڈالا گیا ہے جو انہیں ناول پڑھنے کے بعد ہوا تھا۔مصنفہ کا دوسرا ناول ''نوحہ گر'' مکمل ہونے کے باوجود بھی مشغولیت کی وجہ اب تک شائع نہیں ہوا۔

ایک تخلیق کار اور ادیب جس ماحول میں رہتا ہے اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ہے۔وہ جس زمانے میں رہتا ہے اس زمانے میں ہو رہے ثقافتی تبدیلیوں، ماحول میں ہو رہے سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کو دیکھتا ہے۔اس کے بعد اپنے عمیق مشاہدے اور علم کا استعمال کر کے اس کے بارے میں اپنا ایک نظریہ قائم کرتا ہے۔وہ ان تبدیلیوں

میں یا تو اچھائی دیکھتا ہے یا اس میں اسے برائی دِکھائی دیتی ہے۔ وہ اس سے متاثر ہوئے بغیر وہ نہیں رہ سکتا۔ اپنے فن کو تخلیق دیتے وقت اس میں ان باتوں کا ذکر ارادتاً کرتا ہے تو اسے پڑھ کر یا دیکھ کر یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ اس نے یہ جان بوجھ کر کیا ہے۔ کبھی کبھی وہ اپنی بات ارادتاً کرنا چاہتا ہے لیکن یہ بھی نہیں چاہتا کہ اسے دیکھ کر یا پڑھ کر کسی کو پتہ چلے کے اس نے ارادتاً ایسا کیا ہے۔ اس صورت حال میں وہ اسے اس طرح پیش کرتا ہے کہ بس باتوں ہی باتوں میں یہ بات سامنے آ گئی۔

نسترن احسن فتیحی یونی ورسٹی کے ماحول سے بہت اچھی طرح واقفیت رکھتی ہیں۔ ان کی زندگی کے کئی سال یونی ورسٹی کیمپس کے اندر گزرا ہے۔ اس لیے بہت سی چیزیں جسے انہوں نے ناول میں لکھا ہے اسے پڑھ کر اس کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ کس حد تک یونی ورسٹی کے ماحول سے واقفیت رکھتی ہیں۔ مصنفہ نے اپنے عمیق مشاہدے اور نظریے کا استعمال کر کے ناول ''لفٹ'' لکھا۔ اس میں انہوں نے یونی ورسٹی کے حالات کو ایک پروفیسر اور ایک طالب علم دونوں کی نظروں سے دکھایا ہے۔ اس ناول میں ایک محنتی طالب علم کا کردار ہے جو اپنی محنت اور قابلیت کے بدولت پروفیسر بنتا ہے اور وہ اصول پسند انسان ہے۔ اس ناول میں ایک کردار ایسے طالب علم کا بھی ہے جو اپنی محنت اور قابلیت کے بدولت نوکری پانا چاہتا ہے لیکن اسے تب تک نوکری نہیں مل پاتا جب تک کہ اس کی سفارش نہیں ہوتی۔

اس کا موازنہ اگر ہم آج کے وقت سے کریں تو ہمیں اپنے آس پاس کے یونی ورسیٹی میں یہ حال عام طور پر دیکھنے کو آسانی سے مل جاتا ہے۔ خاص کر یونی ورسٹی میں پروفیسر کی نوکری میں سفارش بہت چلتا ہے۔ صرف یونی ورسٹی ہی نہیں آج کل ہر اس نوکری میں سفارش عام ہو گیا ہے جہاں نوکری کا دارومدار انٹرویو پر منحصر ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اب تو اچھے اسکول، کالج اور یونی ورسٹی میں داخلے کے لیے ہونے والے انٹرویو میں بھی سفارش کے بغیر بہت مشکل سے کامیابی ملتی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ قابلیت سے داخلہ یا نوکری نہیں ملتی ہے۔ سفارش جیسی برائی اس سماج میں اتنا عام ہو گیا ہے کہ محنت اور قابل انسان کو یہ خدشہ لگا ہوتا ہے کہ اگر اس نے سفارش نہیں کی تو شاید اسے کامیابی نہیں ملے گی۔ اس لیے وہ بھی اسی بھیڑ میں شامل ہو جاتا ہے اور اپنے لیے سفارش کراتا ہے۔ سفارش پہلے بھی ہوتا تھا اور آج بھی ہوتا ہے مگر آج کل سفارش کرانے والے لوگوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔

نسترن فتیحی نے اپنے ناول میں یہ بھی دکھایا ہے کہ ایک شیڈول ذات کا انسان سیاست کے جوڑ توڑ کا فائدہ اٹھا کر ایک محنت کش اور اصول پسند انسان کو پیچھے چھوڑتے ہوئے اونچے عہدے پر قابض ہو جاتا ہے۔ درحقیقت ہمارے سماج میں دلت سیاست کرنے کے لیے ہر سیاسی پارٹی موقع کی تلاش میں رہتی ہے۔ دلت ہندو مذہب کے سب سے نچلے ذات کے انسان کو کہتے ہیں۔ ان لوگوں کا استحصال بڑے ذات کے لوگ شروع سے کرتے آئے ہیں اور یہ استحصال آج بھی ہمیں دیکھنے کو ملتا ہے۔ آج بھی پڑھے لکھے طبقے کے کچھ لوگ ذات پات اور مذہب کے بنیاد پر ان کا استحصال کرتے ہیں اور اپنے دلوں میں کینہ اور بغض رکھتے ہیں۔ اس سوچ کو ختم کرنے میں ابھی بہت لمبا عرصہ لگے گا۔ اس کے لیے ہمیں ایک ساتھ مل جل کر رہنے کی ضرورت ہے۔

نسترن فتیحی نے سماج کی جن برائیوں کو اپنے ناول اور افسانوں میں پیش کیا ہے اگر اس کا ہم آج کے زمانے سے موازنہ کریں تو ہمیں اس میں کسی قسم کی کمی نظر نہیں آتی ہے۔ ہم اپنے آس پاس ان چیزوں کو آج بھی بہت آسانی سے محسوس کرتے ہیں۔ آج کی زندگی میں انسان قدرت کے بنائے وسائل کا اس قدر تیزی سے استعمال کر رہا ہے کہ اس کے برے اثرات بھی ہمارے ماحول پہ ہو رہا ہے۔ ایک عورت دوسری عورت کی پریشانیوں اور اس کے کرب کو بہ آسانی سمجھ سکتی ہے اس بات کو سبھی تسلیم کرتے ہیں۔ اس کا ثبوت ہمیں مصنفہ کے افسانوں کو پڑھ کر ملتا ہے۔ نسرتن احسن فتیحی نے عورتوں کی زندگی سے جڑے اہم مسائل کا اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔

راقم الحروف اپنی بات ختم کرنے سے پہلے مصنفہ کی تصانیف کے متعلق خورشید حیات کے نظریے کو پیش کرنا چاہتا ہے۔ اس ضمن میں وہ کہتے ہیں:

> ’’ڈاکٹر نسترن اَحسن فتیحی، ادب زندگی کی "باگمتی" کا نام ہے۔
> نام ہے اُس تنقیدی اور تحقیقی ذہن کے تخلیقی بہاؤ کا جہاں ندی سے ندیوں اور نہروں کے سلسلے آگے بڑھتے ہیں۔
> نسترن احسن فتیحی ایک ایسی ادیبہ کا بھی نام ہے جو نئی صدی کی تیز رفتار زندگی اور زرد پتّوں کی بارشوں میں سُنہری چٹائی تہذیب کی سہیلی بنی ہوئی ہیں۔ نسترن فتیحی اپنی تخلیق و تنقید میں جدید حسیات، لفظیات اور فنی پختگی کے ساتھ رُوحوں میں ابدی حُسن کی ایک نئی دنیا بسانے کا کام بڑی خاموشی سے کر جاتی ہیں۔‘‘

آخر میں راقم الحروف یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ مصنفہ کی فکشن نہ صرف موضوع کے اعتبار سے بلکہ اس کے کردار، پلاٹ،منظر نگاری، مکالمہ نگاری اور اسلوب کے لحاظ سے ایک اچھی تخلیق ہوتی ہے۔ جو لوگ ادب سے تعلق رکھتے ہیں ان کو مصنفہ کی تخلیقات کو ضرور پڑھنا چاہیے۔ اور ان کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کرنی چاہیے۔ کیوں کہ ان کی تخلیقات اردو ادب میں ایک الگ پہچان رکھنے کی مستحق ہیں۔

کتابیات

(1) آل احمد سرورؔ، نظر اور نظریے، مکتبہ جامعہ لیمیٹڈ دہلی، 1973

(2) ارتضیٰ کریم۔ڈاکٹر، اردو فکشن کی تنقید، تخلیق پبلشرز نئی دہلی، 1996

(3) شمش الرحمٰن فاروقی، افسانے کی حمایت میں، مکتب جامعہ لیمیٹڈ نئی دہلی، 2006

(4) علی عباس حسینی، اردو ناول کی تاریخ و تنقید، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑ، 1987

(5) فرمان فتحپوری۔ڈاکٹر، اردو نثر کا فنی ارتقاء، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی 2011

(6) محمد احسن فاروقی۔ڈاکٹر، سید نور الحسن ہاشمی۔ڈاکٹر، ناول کیا ہے؟، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، اشاعت 2006

(7) نسترن احسن فتیحی، ایکو فیمینزم اور عصری تانیثی اردو افسانہ پہلا ایڈیشن، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی، 2016

(8) نسترن احسن فتیحی، لفٹ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2017

(9) وقار عظیم، داستان سے افسانے تک، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 2003

(10) وقار عظیم، فن افسانہ نگاری، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1997